قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ —— لاہور

خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱
پوسٹ کوڈ —— ۵۴۶۶۰
ٹیلیفون : ۸۷۶۲۱۹

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری
معاون : ثریا عندلیب
ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر : عطاء الرحمٰن آرائیں
طابع : سید عبدالسلیم
مطبع : آفتاب عالم پریس
۱۳۔ ہسپتال روڈ۔ لاہور
فون۔ ۲۲۷۳۹۲

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جون ۱۹۹۳ء
جلد ۴۶ —— شمارہ ۶

بدل اشتراک
سالانہ
پاکستان —— ۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک —— ۱۸ امریکی ڈالر
فی پرچہ : -/۱۰ روپے

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۲
نامے جو میرے نام آتے ہیں	ادارہ	۶
زمین اور سورج کی حرکت	ڈاکٹر سید عبدالودود	۷
تلاوت کا قرآنی مفہوم	صاحبزادہ سکندر	۱۴
ہیں آج کیوں ذلیل	ثریا عندلیب	۱۷
سود	ڈاکٹر صلاح الدین	۲۰
اسلام اور سپریم کورٹ	عبداللہ ثانی	۲۸
اکیسویں صدی کے تقاضے	حنیف وجدانی	۵۰
خطبہ حجتہ الوداع	علامہ غلام احمد پرویز	۵۸
نقد و نظر	ادارہ	۶۵
بچوں کے لئے	علامہ غلام احمد پرویز	۷۰
قائداعظم اور مذہبی پیشوائیت (انگریزی)	شمیم انور	۷۳
بوسنیا (ایک المیہ) (انگریزی)	شاکر رضوانی	۷۷
الکتاب (انگریزی)	اعزازالدین احمد خاں	۸۰

لمعات

پچھلے دو شماروں میں ہم نے پاکستان میں بسنے والی ملت اسلامیہ کے اس المیے کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی تھی جس کے باعث یہ خطہ زمین جسے صرف ایک مسلمان مملکت نہیں سچ مچ کی اسلامی مملکت بننا تھا۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا مظہر نہ بن سکا اور ایک اور روائتی مسلمان اکثریت والا ملک بن کر رہ گیا' جس میں احساس کمتری کا مارا ہوا ایک اور ایشیائی انسانی گروہ بس رہا ہے' جو ہر راہنمائی کے لئے مغرب کی طرف دیکھ رہا ہے' طرز معیشت میں' طرز حکومت میں' طرز معاشرت میں اس کا آئیڈیل مغرب ہی ہے ـــــ مغربی جمہوریت' آزاد کھلی منڈی' زندگی کے دیگر معاشرتی شعبوں میں آزاد روش جس پر مغرب کی چھاپ اسے معتبر بناتی ہو ـــــ ہم علم و سائنس کی سطح پر مغرب کے ہمسر اور ہم پلہ تو نہ ہو سکے مگر اپنی آزادی رہن رکھ کر اس کی سائنسی مصنوعات خرید کر فخر کرنے لگے' اپنا طرز زندگی چھوڑ کر اس کی تقلید پہ نازاں ہوئے کہ ہم ترقی یافتہ نظر آئیں' ہم نہ مگ بنا سکے نہ میراج مگر ملک کی ساری دولت ان کی خریداری پر صرف کر کے ترقی یافتہ کہلانے کا حقدار سمجھنے لگے۔ ہم کیوں ایک اسلامی مملکت نہ بن سکے' ہم نے اپنے اداریوں میں کچھ اس کی نشاندہی کی تھی ـــــ انہی دنوں روزنامہ جنگ میں ملک کے ایک منجھے ہوئے متوازن رائے رکھنے والے سینئر صحافی جناب ارشاد احمد حقانی نے بھی اسے موضوع سخن بنایا ہے' اور سعید ملک صاحب کی کتاب "پاکستان کا مستقبل" کے حوالے سے خاصی سیر حاصل بحث کی ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا دعویٰ صرف یہ ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہم نے اسلام کی طرف قدم نہیں بڑھایا بلکہ ہم اس سے دور چلے گئے ہیں اور چلے جا رہے ہیں ـــــ" وہ ہمیں متفق پائیں گے ـــــ اور اس میں بھی کہ "حقیقت یہ ہے کہ یہاں سیاسی اخلاقی' فکری' معاشرتی غرض یہ کہ کسی حیثیت سے بھی اسلام کے لئے زمین ہموار نہیں ہوئی"

وہ اپنے اس بیان میں بھی حقیقت حال بیان کرتے ہیں "اس ملک میں مختلف سیاسی مسلکوں سے تعلق رکھنے والی جماعتیں اور افراد اپنے اپنے مصالح کے تحت مختلف اوقات میں متضاد باتیں کرتے ہیں اور وہی لوگ جو حکمران طبقے کے خلاف بات کرتے وقت یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیتے ہیں کہ قوم اسلام سے دور جا رہی ہے جب اپنی خدمات گنوانے پر آتے ہیں تو یہ ثابت کرنے کے لئے بھی اپنے استدلال کا سارا زور صرف کر دیتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام آنے والا ہے اور اسے کوئی بھی نہیں روک سکتا ـــــ"

"پاکستان کا مستقبل" کے مصنف سعید ملک فرماتے ہیں کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک فیصد بھی ایسے افراد نہیں ملتے' جو اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق ہی سہی اسلام کا ایک نظام زندگی کی حیثیت سے کوئی واضح تصور رکھتے

ہوں۔

حقانی صاحب مدت جماعت اسلامی میں رہے ہیں اسی لئے شاید ابھی تک اس کے لئے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں' اسلامی نظام برپا کرنے کے سلسلے میں سرفہرست ذکر ہی جماعت کا کرتے ہیں' ہماری نظر میں جماعت اسلامی اگر کبھی دینی جماعت تھی بھی تو اس کا وجود مدت ہوئی ختم ہو چکا' اب تو وہ ایک خالصتاً سیاسی جماعت ہے جو اسمبلیوں میں اور اس کے باہر اسی طرح جوڑ توڑ کی سیاست میں مصروف ہے جس طرح دوسری جماعتیں' اسلامی نظام کا نام وہ استعمال ضرور کرتی ہے مگر اسی طرح جس طرح دوسری بزعم خود مذہبی جماعتیں ——— جے یو پی' جے یو آئی' جے ایم' پی اے ٹی وغیرہ' ہاں' ہر ایک کا اسلام کا تصور الگ الگ ہے' اسی لئے جماعتیں بھی الگ الگ ہیں' ہاں اسی کے لئے جس طرح مسلم لیگ کم از کم نصف درجن ٹکڑوں میں بٹ چکی ہے یہ جماعتیں بھی دو' دو' تین تین گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہیں' جے یو پی نیازی' جے یو پی نورانی میں آخر عقیدے مسلک اور طریق کار میں کیا فرق ہے ———

اس بات کو تو انہوں نے تسلیم کر لیا "جب جنرل ضیاء الحق نے برسراقتدار آ کر جماعت اسلامی سمیت ملک کی دینی جماعتوں سے کہا کہ میں پاکستان میں اسلام نافذ کرنا چاہتا ہوں' آؤ میری مدد اور رہنمائی کرو اور یہ بتاؤ کہ اس دور میں اسلامی نظام کے کیا خدوخال ہوں گے اور انہیں کس طرح نافذ کیا جائے گا تو یہ جماعتیں قریب قریب تہی دامن نکلیں' وہ جنرل موصوف کو کوئی قابل ذکر فکری و عملی رہنمائی نہ دے سکیں ———"

مگر وہ اس کا تجزیہ نہیں کر سکے یا نہیں کرتے یا نہیں کرنا چاہتے کہ ایسا کیوں ہے ——— وہ اگر ذرا بھی عمیق نظر سے غور کریں گے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ یہ جماعتیں اس قابل ہیں ہی نہیں' وہ مذہب کے درے کو ہاتھ میں لے کر دوسروں کو ڈرا دھمکا تو سکتے ہیں مگر فکری اور عملی میدان میں ان کے کھیسے میں کچھ بھی نہیں' وہ مکمل طور پر تہی دامن ہیں' سب سے زیادہ حیرانی تو انہیں جماعت ہی پر ہونی چاہئے تھی' دوسری جماعتیں جن بزرگوں کا نام لیتی ہیں انہیں گزرے تو صدیاں گزر چکیں اور یہ جماعتیں ان ہی کی سوچ کی پابند ہیں' کسی اجتہاد کی قائل نہیں' جماعت کے فکری رہنما تو ابھی کل تک ہمارے درمیان موجود تھے' انہوں نے اس دور میں اسلام کے معاشی' معاشرتی' فکری اور سیاسی تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اس کے نفاذ کی کیا تدبیر کی وہ بھی کیوں مغرب کے جمہوری نظام کی زلف کے اسیر ہو کر اس کے دام میں آ گئے' وہی اسمبلیاں' وہی ووٹ حاصل کرنے کے طریق وہی دھونس' دھاندلی' کلاشنکوف ——— جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ اس طریق سے وہ کبھی اسمبلیوں میں اکثریت میں نہ پہنچ سکیں گے کیوں اس سے چمٹے رہے کیوں اس لاحاصل کوشش میں مصروف رہے کہ دوسرے لوگوں کو جو روپے پیسے اثر و رسوخ دھونس دھاندلی سے کامیاب ہو کر اسمبلیوں کے ممبر بن گئے ہیں اسلامی نظام کے نفاذ پر مجبور کر سکیں ———

حقانی صاحب خود کہتے ہیں کہ ساری تاریخ انسانی میں چشم فلک نے آج تک ایک ایسا واقعہ بھی نہیں دیکھا کہ

کوئی گروہ یا طبقہ کسی ایسے نظام کو قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہو جس پر وہ خود بہ صمیم قلب ایمان نہ رکھتا ہو' یہ کام مجبوری اور دباؤ کے تحت انجام ہی نہیں پا سکتا کہ اس کے لئے پختہ ایمان اور عقیدہ اور قلب اور ذہن کی مکمل آمادگی کی ضرورت ہوتی ہے۔

کیا ان کے خیال میں ان کے امیران جماعت سب اس بات سے بے خبر تھے؟ یقیناً نہیں پھر انہوں نے ایسا کیوں کیا' اسلام کے جلد تر نفاذ کے لئے نہیں' جلد تر مسند اقتدار تک پہنچنے کے لئے' اسلام نافذ کرنے کا تو ایک ہی طریقہ ہے جس سے نہ حقانی صاحب ناواقف ہوں گے نہ ہی ان کے ممدوح ——— اور وہ طریقہ سنت نبوی پر عمل کرنے کا ہے ——— ہم حیران ہیں کہ سنت نبوی اور اسوۂ رسول پر دوسروں کو دعوت دینے والے خود اس سے اتنے بے خبر اور بے نیاز کیوں؟ کیا ہم پر یہ لازم نہیں کہ ہم دیکھیں کہ حضور رسالتمآبؐ نے صحابہ کی جماعت کیسے تیار کی تھی ———

انہوں نے اپنی ساری قوم کے سامنے وحی خداوندی ——— قرآن پاک کو پیش کیا' ——— جن نیک روحوں نے اپنے دل و دماغ کی تمام رضامندی سے اسے قبول کیا' اس کی محکومیت پہ یقین کامل کا اعلان کیا انہیں اپنے دامن میں سمیٹ لیا انہیں مزید پختہ کرنے کے لئے انہیں قرآن پاک کی تعلیم دی اور اس تعلیم کی حکمت کی روشنی میں تزکیہ کیا تربیت کی ——— اور اس جماعت نے مخالفتیں برداشت کیں' دکھ سہے مگر اپنے یقین محکم کی بنا پر اس راہ سے ہٹے نہیں' ان کے قدم ڈگمگائے نہیں' مشکلات آئیں تو قدم زیادہ مضبوط ہو گئے' اعلان کیا **انا للہ و انا الیہ راجعون** ——— اور جب وقت آیا تو حق کے دفاع کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ دینے کے لئے بلا تامل میدان میں نکل آئے ——— تعلیم کا' تربیت کا' تزکیہ نفس کا یہ طریقہ یقیناً بہت لمبا ہے مگر اس کا کوئی بدل بھی تو نہیں' کوئی شارٹ کٹ نہیں شارٹ کٹ کے لئے تو دوسروں کا سہارا لینا پڑتا ہے' اوروں کے کندھوں پر سواری کرنی پڑتی ہے اور یہ پھر ان کی مرضی ہوتی ہے وہ جس منزل پر بھی جا اتاریں ———

اسی راستے کی طوالت سے گھبرا کر لوگوں نے شارٹ کٹ ڈھونڈنے کی کوشش کی اور بھیڑ میں کھو گئے' منزل ان کے لئے دور سے دور ہوتی گئی اور آج بقول حقانی صاحب امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد 45 سال بعد سولو فلائیٹ کے ارادے لئے ہوئے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب جماعتیں ضیاء الحق کی رہنمائی کیوں نہ کر سکیں جب کہ وہ ہمہ مقتدر بھی تھے' فوج کی طاقت ان کی پشت پر تھی مذہبی رجحان کے باعث وہ از خود انہیں اپنی مدد کے لئے بلا رہے تھے ——— حقانی صاحب نے سعید ملک کے حوالے سے تعلیم یافتہ طبقے کا تو ذکر کر دیا کہ اس میں ایک فیصد بھی اسلام کا نظام زندگی کی حیثیت سے کوئی واضح تصور نہیں رکھتا ——— مگر مذہبی طبقوں اور جماعتوں سے وہ صرف نظر کر گئے'

درحقیقت ان مذہبی جماعتوں اور ان کے رہنمایان کرام میں بھی اس بالغ نظری کا فقدان ہے' وہ بھی اسلام کو

بس چند عبادات' کچھ رسوم اور ان کے لوازمات' نکاح و طلاق کے قانون' چوری اور زنا کی سزاؤں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے' کوڑے کیسے ہوں کون مارے' دیت کتنی ہو اور بس ——— یہ سارے کا سارا گروہ اسلام کے حرکیاتی اور انقلابی تصور سے ناآشنا ہے' اجتہاد کی روشنی میں ثبات و تغیر کے معنوں سے ناآشنا ہے' ——— اکثر تو بس اپنے مسلک کو تمام تر اسلام سمجھ کر اکیسویں صدی کے تقاضوں سے غافل' صدیوں پہلے لکھے گئے فیصلوں کو جوں کا توں نافذ کرنے کو ہی اسلام سمجھتے ہیں ——— خود جماعت کے تصور اسلام میں بھی نجی ملکیت کے تقدس' بے حساب دولت اکٹھی کرنے اور بے حد و نہایت زمین پہ تصرف اور یہی نہیں غلام اور غلامی کی Institution کا جواز موجود ہے ——— حیرانی کی بات ہے نہ جماعت کے بزرگ امیر کبیر' زمیندار' تاجر' کارخانہ دار تھے نہ ان کے حلقہ میں آنے والے ان کے ارادت مند اور متبعین ——— پھر بھی وہ ایک انقلابی مذہبی جماعت کیوں نہ بن سکی جس کی سوچ حالات سے مطابقت رکھتی قوم کو کیوں رہنمائی نہ دے سکی ——— اس کی وجہ بھی وہی فکری جمود ہے جس میں امت صدیوں سے پھنسی ہوئی ہے ———

غور کریں تو قیام پاکستان کی جنگ غیر مسلموں کی حد تک تو ایک قوم کے حق خودارادیت کی جنگ تھی مگر خود مسلمانوں کے لئے اسلام کے دو تصورات کے درمیان ایک کشمکش تھی' ایک تصور روائتی علماء حضرات کا تھا جس میں اسلام ایک مذہب تھا بندے اور خدا کے درمیان ایک تعلق والا جس میں عبادات اور رسومات تھیں' کچھ قوانین اور سزائیں تھیں شریعت بھی اس میں لائق تعظیم تھی' تصوف بھی اس میں روا تھا جو شریعت کا باغی تھا۔

دوسرا تصور علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا تھا جو اسلام کو ایک طرز معاشرت' ایک اسلوب سیاست ایک انداز معیشت ——— سب پر محیط ایک نظام زندگی سمجھتا تھا' ——— اس جنگ میں یہ علماء حضرات ہار گئے' عوام نے قائداعظمؒ کا ساتھ دیا اور پاکستان قائم کر دکھایا' ——— المیہ یہ ہوا کہ قائداعظمؒ جلد رخصت ہو گئے اور ان کے بعد فکر اقبال کو لے کر آگے بڑھنے والا کوئی سیاسی گروہ نہ تھا دیوبند والوں سے تو امید ہی نہ تھی مگر دارالسلام والے بھی اس فکر کے حامل نہ نکلے ——— نتیجہ سامنے ہے کہ آج حقانی جیسا بالغ نظر صحافی بھی سرگرداں ہے کہ پاکستان میں اسلامی معاشرہ کیوں وجود میں نہ آ سکا ——— سوال جتنا مشکل ہے جواب اتنا ہی آسان ہے ——— قرآن کو راہنما بنایئے' سنت رسولؐ پر عمل کر کے فرقوں سے پاک ایک امت کی تشکیل کیجئے اور تسخیر کائنات کے سفر پر چل نکلئے' انتم الاعلون کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگا اور امت وسطیٰ ایک حقیقت بن کر سامنے آجائے گی ———

نامے جو میرے نام آتے ہیں

محترم ایڈیٹر صاحب "طلوعِ اسلام"

السلام علیکم!

مئی کے شمارہ میں "لمعات" کے تحت آپ نے، جو تجزیے یا مرثیے چھپتے رہے، چھپتے ہیں، چھپتے رہیں گے، ان کا صحیح لب لباب پیش کر دیا کہ تحریکِ قیامِ پاکستان کے وقت ہمارا درد ایک تھا، ہمارا نظریہ ایک تھا اور ہماری منزل ایک تھی۔ لہٰذا ہم نے تمام اختلافاتِ باہمی کو بھلا کر علامہ اقبالؒ کے خیال و خواب کو اپنایا، قائداعظمؒ کی قیادت میں جدّوجہد کی اور جب پاکستان بن گیا، تو ہم نے ان دونوں کا قلبِ صمیم سے شکریہ ادا کیا۔ ایک کا شاندار مقبرہ لاہور میں اور دوسرے کا کراچی میں تعمیر کیا۔ ان پر پھول چڑھائے، اکاڈمی قائم کی، ہر سال برسی مناتے ہیں اور حسبِ توفیق مقالات کا اہتمام کرتے ہیں۔ اب بتائیے اس سے زیادہ ہم ان کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔

اب ہمارا درد، نظریہ اور منزل مشترک نہیں ہے بلکہ انفرادی ہے، ہماری کوششیں نہ ملک کے لئے ہیں نہ ملک کے لوگوں کے لئے بلکہ صرف اپنے لئے کہ کس طرح زائد سے زائد دولت، عزت اور اثر و رسوخ حاصل کر سکتے ہیں۔

ان حالات میں اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا حوالہ دینا کچھ بے وقت کی راگنی معلوم ہوتا ہے۔ کون ان کی خدمات کا منکر یا ناواقف ہے۔ لیکن یہ بتائیے کہ ان کی یاد موجودہ زمانہ میں ہماری دولت میں اضافہ کے لئے کیسے کام آسکتی ہے۔

جس طرح مختلف پیشہ کے لوگ اپنے اپنے پیشوں میں لگ کر روزی کماتے ہیں ویسے ہی کچھ لوگ اس کام پر لگے ہوئے ہیں کہ ایک ہی بات کو بار بار مختلف انداز سے دہراتے رہیں اور نتیجہ میں وہی ڈھاک کے تین پات۔

پاکستان میں تمام پریشانیوں کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے فرمودات کو فراموش کر دیا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کی پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اسلام کے اصولوں کو چھوڑ دیا ہے۔ دونوں باتیں یقیناً سچ ہیں۔ دو باتیں بتائیے کیوں چھوڑا؟ اور اب ان کی طرف کیسے واپس جا سکتے ہیں؟

والسلام

مخدوم زادہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

☆... تحریر: ڈاکٹر سید عبدالودود

زمین اور سورج کی حرکت؟

محترم ایڈیٹر صاحب ماہنامہ طلوع اسلام نے مجھے ہفت روزہ "اہل حدیث" کا شمارہ ماہ نومبر 92ء تبصرہ کے لئے ارسال فرمایا ہے۔ جس میں ایک مضمون کا عنوان ہے "زمین اور سورج کی حرکت؟" افسوس اس بات کا ہے دیگر اقوام عالم نہ صرف چاند تک پہنچ چکی ہیں بلکہ نظام شمسی کے دور دراز سیاروں کے گرد پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن ہمارے "علماء" تاحال اس الجھن میں پھنسے ہوئے ہیں کہ آیا زمین ساکن ہے یا متحرک؟ پہلے سوال کنندہ کا سوال ملاحظہ فرمایئے۔ "اس دور کے تمام سائنس دان اس بات پر متفق ہیں کہ زمین چکر کھاتی ہے اور سورج جامد شے ہے۔ جبکہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین ساکن ہے اور سورج متحرک ہے۔ اصل حقیقت کیا ہے؟

سائل۔ مولانا عبدالرزاق مسعود۔ برطانیہ

پہلے سائل کے (جو کہ مولانا ہیں) علم کی گہرائی سے ملاحظہ فرمایئے۔ انہیں معلوم ہی نہیں کہ وہ سوال کیا پوچھ رہے ہیں۔ سائنس دان اس بات پر کہاں متفق ہیں کہ سورج جامد شے ہے؟ سائنس اور قرآن دونوں کہتے ہیں کہ زمین، سورج، چاند، ستارے کہکشائیں ہر چیز تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی ہے کسی کرّے کا ساکن ہونا ممکن ہی نہیں۔ حیرانی اس بات پر ہے کہ اس سطح کے مولانا یورپ میں بیٹھے مسلمان بچوں کو سبق پڑھا رہے ہیں جب یہ بچے بڑے ہو کر یونیورسٹیوں میں جائیں گے تو وہ کیونکر اسلام سے متنفر نہ ہوں گے؟ ادارہ اہل حدیث کی طرف سے اس سوال کا جواب شامل ہے۔ جواب مختصر ہے لیکن اس میں کوئی بنیادی غلطی نہیں۔ لیکن میں اس کے ابتدائی کلمات کی طرف قارئین کی توجہ ضرور دلانا چاہتا ہوں۔ ہر غیر سائنس دان مفسّر جب سائنس کے کسی موضوع پر بات شروع کرتا ہے تو اس کے فقرے کچھ اسی طرز کے ہوتے ہیں

الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ "قرآن مجید کوئی علم ہیئت، فلسفہ یا فلکیات کی کتاب نہیں جس میں زمین و آسمان، سورج، چاند ستاروں اور ستاروں کی حقیقت، ماہیت یا ان کی گردش و سکون سے بحث کی گئی ہو قرآن کریم ایک دستورِ زندگی پیش کرنے والا ہدایت نامہ ہے جس میں ان سب مسائل پر بحث کی گئی ہے جن کا تعلق انسان کی ہدایت اور رہنمائی سے ہے یعنی یہ تو امور شریعہ کو سامنے لاتا ہے امور تکوینیہ سے بحث اس کے موضوع سے خارج ہے وہ ان امور پر بحث نہیں کرتا، جس سے انسان کی کوئی شرعی ضرورت وابستہ نہ ہو"

گویا ہمارے مولوی صاحبان قرآن کی تقریباً 750 آیات کجو کہ قرآن کے متن کا 8/1 حصّہ ہیں کوئی اہمیت نہیں

دیتے بلکہ اسے زائد از ضرورت شے تصوّر کرتے ہیں۔ حالانکہ سائنسی تحقیق کے ذریعے جس قدر کائناتی راز نکھر کر انسان کے سامنے آتے ہیں اسی قدر اور قرآن پر ایمان محکم ہوتا جاتا ہے۔ اور پھر قرآن تسخیر کائنات پر بار بار زور دیتا ہے۔ **سنریھم ایتنافی الافاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق** --- (41:53)

"ہم ان کو اطراف عالم میں بھی اور خود ان کی ذات میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ (قرآن) حق ہے۔"

و فی الارض ایت للموقنین و ان فسکم افلا تبصرون (51:2-21) "اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفوس میں، تو کیا تم اس پر غور و فکر نہیں کرتے؟"

ان فی خلق السموات و الارض --- و ماللظلمین من انصار (3:190-192) "بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے میں صاحبان عقل و بصیرت کے لئے نشانیاں ہیں جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے قانون خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور آسمان و زمین کی پیدائش پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے پروردگار تو نے اسکارگہہ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے۔ تیری ذات اس سے بعید ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلا غرض و غایت پیدا کرے (یہ ہماری کم نگاہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں) تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیق و تجربات کے بعد اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں۔ جو قومیں اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے اشیائے کائنات کی نفع بخشی سے محروم رہتی ہیں ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جاتی ہیں اور وہ ذلّت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل و خوار قوموں کا کوئی یارومددگار نہیں ہوتا"

علاوہ ازیں یہ کہنا بھی غلط ہے کہ قرآن ان مسائل پر بحث نہیں کرتا جن سے کوئی شرعی ضرورت وابستہ نہ ہو۔ قرآن بار بار مظاہرِ فطرت کی طرف اشارے کرتا جاتا ہے تاکہ تم ان پر غور و فکر کر سکو۔

اب آیئے مسئلہ زیر بحث کی طرف یعنی "زمین ساکن ہے کہ متحرک"

کائنات کا ذرہ ذرہ متحرک ہے۔ ہر مادی شے ایٹم کی بنی ہوئی ہے، جو اشیاء بظاہر ساکن نظر آ رہی ہیں ان کے ہر ایٹم کے اندر Electrons الیکٹرون اپنے NUCLEUS کے گرد ایک لاکھ میل فی سیکنڈ کے حساب سے چکر لگا رہے ہیں کہکشاں، ستارے (سورج بھی ایک ستارہ ہے) سیارے (زمین بھی ایک سیارہ ہے) اور Satellites یعنی چاند (زمین کا صرف ایک چاند ہے۔ دیگر سیاروں کے گرد بہت سے چاند ہیں) ان میں سے کوئی بھی شے ساکن نہیں ہے۔ **کل فی فلک یسبحون** (36:40) "ہر (کرہ) اپنے مدار کے اندر تیزی سے گھوم رہا ہے" یاد رکھیئے کہ کسی آسمانی

کرے کا ساکن رہنا ناممکن ہے۔ ہر کرّہ اپنے اپنے مدار میں مرکز ثقل کے گرد گھوم رہا ہے اور یہی گردش اسے اپنے مدار کے اندر تھامے رکھتی ہے۔ ہر وہ شئے جو گردش میں ہے اسے اپنے مدار میں قائم رکھنے کے لئے دو قوّتوں کی ضرورت ہوتی ہے (Centripetal) جو اسے مرکز ثقل کی طرف کھینچتی ہے اور (Centri - fugal) جو اسے باہر کی طرف کھینچتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک پتھر کے ٹکڑے کو لیجئے جو ایک رسی کے سرے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ آپ اس پتھر کو زور سے گھمائیں۔ آپ کے ہاتھ کی قوّت اسے اندر کی طرف کھینچ رہی ہے اور پتھر کے گھومنے کی قوت باہر کی طرف جب تک دونوں قوتیں برابر رہیں گی پتھر گھومتا جائے گا اگر برابر نہ ہوں تو پتھر گر جائے گا۔ ان ہی قوّتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا:

اللہ الذی رفع السموٰت بغیر عمد ترونھا(13:3)

"یہ اس خدا کی طرف سے ہے جس نے اتنے بڑے اجرام فلکی کو فضا کی بلندیوں میں معلق کر رکھا ہے اور جیسا کہ تم دیکھتے ہو کوئی ستون ان کو تھامے ہوے نہیں"

خلق السموٰت بغیر عمد ترونھا(31:10)

"اس نے آسمانی کرّوں کو پیدا کیا اور تم دیکھتے ہو کہ کوئی ستون ان کو تھامے ہوئے نہیں۔"

والسماء رفعھا والمیزان(7-55)

آسمانی کروں کو اس نے معلق کر رکھا ہے اور ان کے درمیان ایک میزان Balance قائم کر رکھا ہے۔

نظام شمسی کے سیاروں کا مرکز ثقل سورج ہے۔ جس قدر کوئی سیاّرہ سورج سے زیادہ نزدیک ہے اسی قدر تیزی سے گھومتا ہے۔ عطارد کا فاصلہ سورج سے 36 ملین میل ہے۔ یہ 30 میل فی سیکنڈ کے حساب سے حرکت کرتا ہے اور 88 دن میں سورج کے گرد ایک چکر پورا کرتا ہے۔ زمین سورج سے 93 ملین میل دور ہے اور ایک سال میں سورج کے گرد ایک چکر پورا کرتی ہے اور 18ء5 میل فی سیکنڈ کے حساب سے گھومتی ہے۔ سب سے زیادہ دور سیارہ پلوٹو ہے جس کا فاصلہ سورج سے 3666 ملین میل ہے اور یہ تین میل فی سیکنڈ کے حساب سے 248 سال میں سورج کے گرد چکر لگاتا ہے۔

اب آیئے ان آیات قرآنی کی طرف جن میں زمین کے متحرک ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ **الم نجعل الارض مھدا والجبال اوتادا**(78:6-7) "کیا ہم نے زمین کو آسائش کا گہوارہ نہیں بنایا اور پہاڑوں کو (اس کی) میخیں (نہیں ٹھہرایا تاکہ یہ ڈگمگائے نہیں) ہمارے مولانا' صاحبان اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ پہاڑوں کے بوجھ کی وجہ سے زمین ساکن ہے۔ یہ تصوّر صحیح نہیں آپ لکڑی کا ایک گولہ لے کر اس کے ارد گرد میخیں گاڑ دیں۔ یہ میخیں گولے کی حرکت میں رکاوٹ نہیں بن سکیں گی۔ میخیں تو بے شک ساکن ہو

جائیں گی۔ گولہ ساکن نہیں ہو گا۔ البتہ اس لکڑی کے گولے کو آپ کسی دوسری شئے کے اوپر رکھ کر میخوں کے ذریعے جوڑ دیں تو پھر یہ حرکت نہیں کرے گا۔ لیکن کیا زمین پہاڑوں کی میخوں کے ذریعے کسی چیز کے ساتھ جڑی ہوئی ہے جو اسے ہلنے نہیں دیتی؟ قرآن کریم نے پہاڑوں کو جو میخیں کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مضبوطی کے ساتھ زمین میں گڑے ہوئے ہیں۔ اب آیئے آپ کے اس تخیّل کی طرف کہ پہاڑوں کے بوجھ کی وجہ سے زمین ہل نہیں رہی۔ یہ خیال کس قدر سطحی ہے' اس کا اندازہ اس چیز سے لگایئے کہ زمین کے اندرونی حصے کا بوجھ اس قدر ہے کہ پہاڑوں کا بوجھ اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ زمین کی سطح پر Earth's crust ہے جس کی گہرائی' خشکی پر 20 تا 25 میل ہے۔ لیکن سمندر کی تہہ میں صرف 3 میل ہے Crust کے اندر Mantle ہے اور اس کے اندر مرکز میں Inner Core ہے جس کی موٹائی 850 میل ہے۔ پہاڑ جس مادہ سے بنے ہوئے ہیں (silica) اس کی Density 2.7 ہے اور زمین کے اندر کا مادہ (لوہا اور سکہ) کی Density اس کے مقابلہ میں سولہ ہے۔ اب آپ اندازہ لگایئے کہ زمین کی Crust جس میں پہاڑ واقع ہیں اور جس کی گہرائی صرف 20 تا 25 میل ہے اور زمین کا اندرونی حصّہ جس کی گہرائی 1800 + 1310 + 850 = 3960 میل ہے اور لوہے اور سکّے کا بنا ہوا ہے ان کی آپس میں کیا نسبت ہے؟ چنانچہ اگر بوجھ زمین کی حرکت میں مانع ہو سکتا تو زمین کا اندرونی وزن جو پہاڑوں کے وزن سے کروڑوں گنا زیادہ ہے مانع ہوتا۔ تاہم زمین اس کے باوجود گردش میں ہے۔ زمین تو نسبتاً ایک چھوٹی چیز ہے' سورج اور سورج سے ہزاروں گنا وزنی ستارے سب گردش میں ہیں۔ چنانچہ وزن کا کسی کرّے کی گردش میں مانع ہونا ایک طفلانہ تخیل ہے۔

ہمارے مولانا صاحبان کے نزدیک اگر زمین ساکن ہے تو دن کے بعد رات کیسے آتی ہے اور رات کے بعد دن کیسے آتا ہے؟ دن اور رات کی لمبائی سارا سال کیوں بدلتی ہے؟ دن اور رات کا یکے بعد دیگرے آنا زمین کا اپنے AXIS کے گرد لٹو کی طرح 24 گھنٹے میں چکر لگانے یعنی ROTOTION کی وجہ سے ہے اور موسموں کا بدلنا زمین کا سورج کے گرد ایک سال میں چکر لگانے یعنی REVOLUTION کی وجہ سے ہے۔ دن اور رات کی لمبائی کا سارا سال بدلتے رہنا زمین کا اپنے AXIS سے $23\frac{1}{2}^{\circ}$ جھکے رہنے کی وجہ سے ہے SATELLITES (چاند) سیاروں کے گرد گھوم رہے ہیں۔ سیّارے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں اور سورج اپنے GALLACTIC NUCLEUS کے گرد گھوم رہا ہے۔

پھر قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

والقٰی فی الارض رواسیَ ان تمیدبکم --- (31:11)

تمید مادہ - م ی د - کے معنی شدّت سے حرکت کرنا بھی ہے چنانچہ اس آیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے زمین میں پہاڑ بنا کر رکھ دیئے تاکہ وہ تم کو ہلا نہ ڈالے (ترجمہ فتح الحمید)

"He Set on the earth mountains Standing firm, lest it - should Shake With you"

(ترجمہ عبداللہ یوسف علی)

اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھئے۔ ایک گھوڑا گاڑی کا گھوڑا بہت تیز رفتار ہے لیکن گاڑی کا وزن بہت ہلکا ہے ظاہر ہے کہ اس گاڑی میں بیٹھ کر ہچکولے لگیں گے۔ لیکن اگر گاڑی کا وزن زیادہ ہو تو ہچکولے نہیں لگیں گے۔ یہی چیز آپ ایک کار میں بیٹھ کر محسوس کرتے ہیں۔ چھوٹی گاڑی یا رکشا میں بیٹھ کر سخت ہچکولے لگتے ہیں جب بڑی گاڑی میں تیز رفتاری کے باوجود سفر آرام سے گذرتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں زمین کی تیز رفتاری کی طرف اشارہ ہے۔ ہم زمین کی سطح پر رہتے ہیں زمین کی حرکت تیز ہے۔ چنانچہ پہاڑوں کا وزن Balance قائم رکھتا ہے اور ہم محسوس نہیں کرتے کہ جس زمین کی سطح پر ہم بیٹھے ہیں وہ گھوم رہی ہے۔

یہ عجب بات ہے کہ ہمارے مولوی صاحبان کو قرآن کریم کے اندر کوئی ایسی آیت نہیں ملتی۔ جس میں زمین کی حرکت کی طرف اشارہ ہو۔ اور مولانا' عبدالرزاق مسعود۔ برطانیہ' کس جرأت کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ "قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین ساکن ہے" اگر ہمارے مولانا' صاحبان کو کوئی ایسی آیت نہیں ملتی تو لیجئے میں ان کی خدمت میں ایک اور آیت پیش کر رہا ہوں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ زمین کی گردش اس قدر تیز ہے کہ پہاڑ بادلوں کی طرح اڑے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

و تری الجبال تحسبها جامدة و هی تمر السحاب صنع الله الذی اتقن کل شی (27:88)

اور تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو خیال کرتے ہو کہ وہ اپنی جگہ پر کھڑے ہیں مگر وہ اس طرح اڑتے پھرتے ہیں جیسے بادل' یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مستحکم بنایا۔ یعنی پہاڑ زمین کی اس قدر تیز حرکت کے باوجود مستحکم ہیں۔

ادارہ اہل حدیث' کے جواب دہندہ نے زمین کی حرکت کے متعلق ادھر ادھر کے حوالوں کے بعد یہ موقف پیش کیا ہے کہ "سائنس کی رو سے تو ثابت شدہ ہے کہ زمین متحرک ہے لیکن قرآن نہ اس کا اثبات پیش کرتا ہے اور نہ انکار' کیونکہ یہ اس کے موضوع سے خارج ہے" چنانچہ میں ادارہ اہل حدیث کی خدمت میں گذارش کروں گا کہ قرآن کو پھر سے بغور پڑھیں۔

ادارہ اہل حدیث' کی طرف سے جن صاحب نے جواب دیا ہے۔ انہوں نے قرآن کریم کی ایک اور آیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن وہ اسے پوری طرح واضح نہیں کر سکے۔ اس آیت میں لفظ مستقر کے متعلق میرے ذہن میں بھی الجھن موجود تھی۔ لیکن محترم پروفیسر محمد انور بھٹی (ریٹائرڈ) ہیڈ آف ASTRONOMY ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی کی مدد سے یہ الجھن دور ہو گئی آیت یہ ہے۔ **و الشمس تجری لمستقر لها ذالک تقدیر العزیز العلیم** (36:38)

"سورج اپنے مستقر کی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس خدا کے ٹھہرائے ہوئے اندازوں کے مطابق ہو رہا ہے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے اور جس کا ہر قانون علم پر مبنی ہے" ڈاکٹر Maurice Bucaille نے اپنی کتاب THE BIBLE, THE QURAN AND SCIENCE میں لکھا ہے کہ یہ سورج کی آخری رہائش گاہ کی طرف اشارہ ہے۔ سورج اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا ایک مقام کی طرف چلا جا رہا ہے اور انرجی ختم ہونے کے بعد اس مقام پر ٹھہر جائے گا۔ اور ہمیشہ کے لئے یہیں اسی جگہ رہے گا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ مقام ہے۔ (CONSTELLATION OF HERCULES (ALPHA LYR AE)

نوٹ CONSTELLATION کے معنی ہیں ستاروں کا جمگھٹا۔ جب ہم آسمان پر رات کے وقت نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ستارے گروپس کی شکل میں ہیں۔ مثلاً جب ہم قطبی تارے پر نگاہ ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ستاروں کا ایک گروپ ہے اور یہ سب اکٹھے حرکت کرتے ہیں ALPHA LYRAE بھی ایک ایسے ہی گروپ میں موجود ہے جس کا نام CONS. OF HERCULES ہے یہ گروپ ایک خیالی لکیر کے اندر واقع ہوتے ہیں مثلاً یہ کہا جائے کہ لاہور پنجاب میں ہے تو لاہور کی نشاندہی ہو جائے گی لیکن اس کا صحیح مقام معلوم نہیں ہو گا۔ مزید وضاحت کے لئے دیکھئے کہ سورج کی دو حرکتیں ہیں۔

1... ایک تو جس طرح زمین سورج کے گرد ایک سال میں چکر لگاتی ہے اسی طرح سورج اپنے (Galactic nucleus) کہکشانی مرکز کے گرد (کہکشاں کے دیگر ستاروں کے ساتھ) چکر لگاتا ہے اس چکر میں اس کی رفتار 216 کلو میٹر فی سیکنڈ کے حساب سے ہے۔

2... سورج کی دوسری حرکت اس کی ذاتی حرکت ہے (یعنی اس کا کہکشاں کے دیگر ستاروں کی حرکت سے کوئی نسبت نہیں ہے)

1718ء میں EDMUND HALLEY نے اشارہ کیا تھا کہ ستارے ایک جگہ پر FIX نہیں ہیں بلکہ مختلف سمتوں میں حرکت کر رہے ہیں۔ جن کی دیگر ستاروں سے کوئی نسبت نہیں سورج اپنے مستقر CONSTELLATION OF HERCULES کی طرف 20 کلو میٹر فی سیکنڈ سے حرکت کر رہا ہے۔ سورج کی اس ذاتی حرکت کی مزید وضاحت کے لئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ "ایک مسافر گاڑی شمال کے رخ حرکت کر رہی ہے مسافروں میں سے ایک شخص اٹھ کر غسل خانہ کی طرف جاتا ہے۔ ٹرین کی شمال کی طرف حرکت میں سب مسافر شامل ہیں لیکن غسلخانہ کی طرف ایک مسافر کی اس کی ذاتی حرکت ہے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ALPHA LYRAE واقعی سورج کا آخری مقام ہو گا جہاں جا کر وہ ہمیشہ کے لئے ٹھہر جائے گا؟ اس کا جواب جو پروفیسر انور بھٹی صاحب نے دیا تھا وہ یہ ہے۔

۔ یہ ضروری نہیں کہ ALPHA LYRAE تک پہنچنے کے بعد سورج کی انرجی واقعی ختم ہو جائے گی۔
۔ سورج کی دو مختلف حرکات کی وجہ سے یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کا آخری مستقر ALPHA LYRAE ہی ہو گا۔

ازروئے قرآن یہ بھی ضروری نہیں کہ مستقر کو ہمیشہ ہمیشہ ٹھہرنے کا مقام کہا جائے۔ مثلاً نفس واحدۃ (ZYGOTE یا جفتہ) کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ **وھو الذانشا کمر من نفس واحدۃ فمستقر و مستود ع** ۔ (6:99) "وہی تو ہے جس نے تم کو ایک واحد خلئے سے پیدا کیا' پھر اسے ٹھہرنے کے لئے عارضی جگہ دی (یعنی رحم مادر کے اندر) اور پھر اسے اگلی منزل کے سپرد کر دیا"

قارئین کرام! گذارش ہے

جیساکہ آپ کے علم میں ہے. طلوعِ اسلام ایک جریدہ ہی نہیں بلکہ ایک زندہ اور زندگی بخش تحریک ہے جس کا مقصد قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔

پرچے کا خریدار بن کر آپ نے قرآنی فکر کو آگے بڑھانے میں ہمارا ساتھ دیا ہے جس کے لئے ہم آپ کے تہہِ دل سے ممنون ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آپ آئندہ بھی اسے جاری رکھیں گے. تاہم اگر کسی وجہ سے آپ کے لئے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں حصّہ لینا ممکن نہ ہو تو براہِ کرم ہمیں مطلع فرما دیجئے تاکہ ہماری طرف سے آپ کو یاددہانی کے خطوط وصول کرنے کی زحمت نہ ہو۔

زرِ شرکت بدستور ۱۲۰/- روپے اندرونِ ملک اور ۴۰۰/- روپے بیرونِ ملک ہے۔ اللہ نگہبان

محمد لطیف چودھری
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

☆... تحریر: صاحبزادہ سکندر ایڈووکیٹ پشاور

تلاوت کا قرآنی مفہوم

تاریخ انسانیت کا کوئی صفحہ ایسا نہیں جس میں کسی نہ کسی حوالہ سے خود انسانیت کی فلاح اور بہبود کے لئے آسمانی رشد وہدایت کا ذکر موجود نہ ہو۔ صرف عقلِ انسانی پر یہ یقین کر لینا کہ وہ انسانیت کو کامیابی کے ساتھ منزل مراد تک پہنچائے گی خود انسانی عقل کی سب سے بڑی بھول ہے یہ صرف اور صرف وحی ہے جو انسان کو اس کے خود ساختہ گورکھ دھندوں سے نکالنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اب اس وحی کی روح کو چھوڑ کر اس کے الفاظ تک خود کو پابند کر لینا اور پھر اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جانا کہ وحی خداوندی کا مقصد پورا ہو گیا اس سے بھی زیادہ بھول ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہی کچھ ہوتا رہا تھا اور حضور صلعم کے بعد یہی کچھ ہوا۔ یہود و نصاریٰ نے اپنی مجالس کا آغاز تورات اور انجیل سے چند کلمات کے پڑھنے سے کیا۔ یہ کلمات بھی کبھی لاطینی، کبھی عبرانی، کبھی انگریزی اور اب اردو میں ادا کئے گئے۔ ہندوؤں نے اپنی آسمانی کتابوں کے اشلوک پڑھنے سے محافل سجائیں۔ دیکھا دیکھی وہ مذہب جو بعد میں پیدا ہوئے مثلاً سکھ، انہوں نے گرنتھ صاحب کے پاٹھ پاٹے۔ اگر آپ نے غور کیا ہو تو ہماری ہر مجلس، جلسہ یا محفل کا آغاز تلاوت قرآن سے ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر کوئی قاری تلاوت ذرا لمبی کر دے تو سامعین اکثر ایک دوسرے کو گھورنا شروع کر دیتے ہیں اور دبے دبے الفاظ میں یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ "قاری صاحب شاید ختم القرآن کرنا چاہتے ہیں" ——— ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ قاری جس کتاب میں سے تلاوت کر رہا ہے اس کے ایک بھی لفظ کو سامعین کی اکثریت نہیں سمجھتی۔ ظاہر ہے جس تلاوت کی سمجھ نہ آتی ہو اس کا حشر یہی تو ہونا ہے۔ تلاوت صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ برکت ہو۔ کوئی نہیں جانتا کہ برکت کیا چیز ہے۔ اور تلاوت کسے کہتے ہیں۔ بس آغاز ایک ایسے کلام سے ہوا جس کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اگر یہی حالت ہے تو پھر برکت کیسے ہو گی۔ یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ تلاوت کے نہ تو معانی ہر کوئی سمجھتا ہے اور نہ ہی تلاوت کا مفہوم معلوم ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ تلاوت کرنے والے کو قاری کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کا آپس میں کتنا تعلق ہے یہ اپنے طور پر دلچسپ بحث ہے۔

قرآن کریم کے حوالے سے جب بھی لفظ "تلاوت" ادا کیا جاتا ہے تو اس کا عمومی تصور ذہن میں یہی ابھرتا ہے

کہ صرف قرآن کریم کے نص (TEXT) کو پڑھ لیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ تصور بھی ذہن نشین کرا دیا گیا ہے کہ قصد قرآن صرف "تلاوت" سے حل ہو جاتا ہے۔ اور ہر لفظ کے بدلے تیس نیکیوں کا ثواب اس کے قاری کے اعمال نامے میں لکھ دیا جاتا ہے حالانکہ یہ تصور غیر قرآنی ہے، اور اسے کسی طور بھی کتاب اللہ کی تائید حاصل نہیں۔ یہ تصور سراسر مذہبی پیشوائیت کی پیداوار ہے۔ اگر قاری کے حصے میں ایک لفظ کے بدلے میں تیس تیس نیکیوں کا ثواب لکھا جانا مقصود ہے تو پھر سامع کے حصے میں کیا آتا ہے۔ ظاہر ہے کچھ بھی نہیں۔ اس لئے قاری کے لئے تو ثواب کی "لوٹ سیل" لگی ہوئی ہے جبکہ سامع صرف سر پر رومال ڈالنے سے زیادہ کچھ نہیں کما سکتا۔ آیئے ذرا دیکھیں تلاوت کا مفہوم کیا ہے۔

لفظ تلاوت عربی زبان کے لفظ "**تلاوۃ**" سے ماخوذ ہے۔ جس کا مادہ (ت-ل-و) ہے۔ اسی مادے کی بنا پر **تلو** **تلہ**۔ **تلیتہ**۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ **اتلیتہ ایاہ** میں نے اس سے اس کی پیروی کرائی۔ اسے اس کے پیچھے لگایا۔ **تلو** وہ شخص جو ہمیشہ پیچھے پیچھے چلے۔ **التلو** جو چیز کسی کے پیچھے آئے۔ اونٹ، خچر یا بکری کا بچہ جو اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلے۔ **اتلت الناقۃ**۔ اونٹنی کے پیچھے پیچھے اس کا بچہ چلا **التلیتہ**۔ اور **التلاوۃ**۔ قرض وغیرہ کے باقی ماندہ حصہ کو کہتے ہیں جو پیچھے (باقی) رہ جاتا ہے۔ لفظ تلاوت کا مفہوم دراصل پیچھے پیچھے چلنا اور اتباع کرنا ہی نہیں بلکہ یہ لفظ قرآن کریم پر عمل کرنے کے لئے بھی اپنے اندر ایک مفہوم رکھتا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت 121 میں ارشاد ہوا۔

الذین اتینھم الکتاب یتلونہ حق تلاوتہ اولئک یؤمنون بہ۔

"جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے۔ یہی لوگ ہیں جو اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔" ظاہر ہے کہ اس میں تلاوت کے معنی اتباع کرنے کے ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ لوگ درحقیقت اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ورنہ اگر اس کے معنی فقط پڑھنے کے ہوں تو قرآن کو تو غیر مسلم بھی پڑھتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ لہٰذا قرآن کی تلاوت سے مراد اس کے احکام کا اتباع ہے اسے پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ اسے سمجھا جائے اور سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ اس پر عمل کیا جا سکے۔ قرآن کا اس طرح پڑھنا کہ وہ سمجھ میں نہ آئے یا اسے فقط سمجھ لینا اور اس پر عمل نہ کرنا، کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ مومن درحقیقت وہی ہیں جو اس کی پوری پوری پیروی کرتے ہیں۔ اسی طرح سورہ آل عمران کی آیت 163 ملاحظہ ہو قرآن مجید میں نبی اکرم کے متعلق جو فرمایا ہے کہ **یتلو علیھم ایاتہ** وہ جماعت مومنین کے سامنے خدا کے احکام پیش کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ **ویزکیھم** وہ ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ تلاوت قرآن سے مقصود یہ ہے کہ خدا کا نظام عملاً متشکل ہو جائے جس کے تعمیری نتائج (یعنی افراد معاشرہ) کی نشوونما محسوس صورت میں سامنے آ جائیں۔ یہی وہ برکت ہے جس کا ذکر اوپر ہو

چکا۔ صرف قرآن پڑھ لینے کو تلاوت کہنا اور سمجھ لینا کہ اس سے مقصد حاصل ہو گیا ہے پھر سمجھ لیجئے کہ قرآن کا پڑھنا اس لئے ضروری ہے کہ اسے سمجھ لیا جائے اور سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اگر قرآن کو سمجھا نہ جائے تو اس کا فائدہ نہیں دے سکتا۔ اور اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو اس کا سمجھنا بھی بے کار ہے۔ سورہ الصفت میں **فالتلیت ذکرا** (3 / 37) آیا ہے۔ یعنی قرآن کا اتباع کرنے والی جماعتیں سورہ بقرہ کی اس آیت نے معاملے کو بالکل واضح کر کے رکھ دیا۔ اور وہ ہے یہودیوں کے خلاف ایک الزام۔ فرمایا **و اتبعوا ما تتلو الشیطین علی ملک سلیمن** (102 / 2) یہ ان باتوں کی پیروی کرتے ہیں جو شیاطین (دین خداوندی کے دشمنوں) نے مملکت سلیمان کے متعلق عام کر رکھی تھیں" اگر یہ دیکھنا ہو کہ دین خداوندی کے دشمنوں نے انبیائے بنی اسرائیل کے خلاف کیا کیا افسانے وضع کئے تھے۔ اور یہودی کس طرح ان افسانوں کو آسمانی تعلیم مانتے ہیں۔ تو اس کے لئے تورات (بائیبل کا عہد نامہ عتیق) پڑھیئے۔ اس میں ایسی ایسی باتیں ان انبیائے کرام کے خلاف موجود ہیں جنہیں کوئی حساس انسان سن بھی نہیں سکتا۔ اور یہ سب کچھ ہماری مذہبی کتابوں میں بھی پوری پوری طرح پائی جاتی ہیں۔

اسی طرح لفظ تلاوت کے علاوہ "قراۃ" بھی عربی زبان میں مستعمل ہے۔ لیکن قراۃ کا لفظ تلاوت کے اندر ہی آ جاتا ہے لہذا لفظ تلاوت کا مفہوم صرف پڑھنا ہی نہیں بلکہ اتباع اور عمل کرنا بھی ہے۔

دینِ مُلّا

دینِ حق از کافری رُسواتر است ۔ زانکہ مُلّا مومن کافر گر است

شبنمِ ما در نگاہ ما یم است ۔ از نگاہِ او یم ما شبنم است

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ۔ ملت از قال و اقولش فرد فرد

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب ۔ کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد

دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

(اقبالؒ۔ جاوید نامہ)

☆... تحریر: ثریا عندلیب

ہیں آج کیوں ذلیل

آج ہم اپنی اس طلوع اسلام کنونشن میں چچا غالب کی زبانی باری تعالیٰ کے حضور یہ شکوہ کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ یا رب العالمین! تجھے جو اپنے آدم کی جناب میں گستاخی فرشتہ بھی گوارا نہ ہوئی تھی آج اسی آدم کی اولاد پر یہ کیسا زوال چھایا ہے کہ امت مسلمہ بھری دنیا میں ذلیل و رسوا ہو کر رہ گئی ہے۔ اور عزّت و احترام کا ہر مقام اس سے چھن گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟

ہاں صاحب! ہم تو اپنا درد دل شکوہ کی صورت میں لبوں پر لے آئے۔ مگر کیا ہم اس کا جواب سن بھی سکیں گے۔ یہ میرے اور آپ کے سوچنے کی بات ہے۔ آیئے ذرا اس آواز پر کان دھریں جو ہم سے مخاطب ہو کر علی الاعلان کہہ رہی ہے کہ ۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔ تم کس منہ سے اور کس برتے پر یہ شکوہ کرنے کی جرأت کر رہے ہو۔ تم دینِ اسلام کے نام لیواؤں نے اسلام کا نام لے لے کر کس کس طرح اس کا استحصال نہیں کیا۔ تم تو اپنی ذلت و رسوائی کی شکایت کرنے کا استحقاق بھی کھو بیٹھے ہو۔ اس زوال کے ذمہ دار تم خود ہو۔ ذرا نظر ڈالو۔ دورِ ملوکیّت سے لے کر آج تک کی اپنی تاریخ پر اللہ کے عطا کردہ دینِ اسلام کو تم نے مذہب اسلام میں بدل کر کیا کیا فساد انگیزیاں اور تباہیاں نہیں مچائیں اور اس خود ساختہ جامد مذہب کے ہاتھوں انسانی قدوم آگے بڑھانے پر پابندیاں نہیں لگائیں! آج فریادی بن کر یہ پوچھ رہے ہو کہ ہم ذلیل کیوں ہو گئے؟ اسلام اسلام کہتے ہوئے تم نے گمراہی کی جو روش پکڑ رکھی ہے اور جس ڈھٹائی سے اس پر جمے کھڑے ہو، قانون خداوندی کے مطابق اس کا لابدی نتیجہ ذلت و رسوائی ہو گا۔ کیا تم اس سے بچ سکتے تھے یا بچ سکو گے یہ قرآن کی آواز ہے جو ہم سے مخاطب ہے اور پکار پکار کر کہہ رہی ہے **فلن تجد لسنت اللہ تبدیلا** تم ہرگز اللہ کے قانون کو بدلتا نہ پاؤ گے **لا ریب** اللہ کا قانون کبھی نہیں بدلتا۔ لیکن ہم جو اس قانون یعنی اس کی کتاب قرآن کریم پر ایمان کامل رکھنے کے دعویدار ہیں بلا تامّل اس کو بدل ڈالتے ہیں اور پھر یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ ہمارے نصیب کیوں جل گئے؟ نصیبوں کی آگ تو اسی وقت بھڑک اٹھی تھی جب دین کو مذہب میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور پھر ہم نے زندہ و پائندہ قرآن کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یہی نا کہ تلاوتِ قرآن کے نام پر ختمِ قرآن کی اصطلاح گھڑی اور خاص طور پر قل و چہلم کی وضعی تقریبات پر قرآن خوانی کی صورت میں ختم قرآن کی محفلیں سجائی

جاتی ہیں اور گن گن کر قرآن ختم کیا جاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ اس ختم قرآن کی اصطلاح پر کیا یہ سوچ کر ہمارے قلب و ذہن کپکپا نہیں اٹھتے کہ ہم قرآن ختم کرنے میں مشغول ہیں۔ ہم قرآن سے زندگی حاصل کرنے کی بجائے اسے موت کے حوالے سے استعمال کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ کیا ہماری یہ روش ہماری پستی [redacted] ضح دلیل نہیں؟ پھر بھی ہمیں اپنے مسلمان ہونے یا کہلوانے پر اصرار ہے۔ مسلمان تو ہر قدم پر قرآن [redacted] صل کرتا ہوا عروج و ارتقاء کی راہیں طے کرتا ہے۔ ہمارے ذہن تو تاریکیوں میں گھر کر اس حالت کو پہنچ چکے ہیں جیسا کہ قرآن نے یوں بیان کیا ہے۔ **لو او کظلمت فی بحر لجی یغشہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب ظلمت بعضھا فوق بعض اذا اخرج یدہ لم یکد یرٰھا و من لم یجعل اللہ لہ نورا فمالہ من نور** ہ 40 ۔ 24 جیسے سمندروں کی گہرائیوں میں تاریکیوں کی لہر پر لہر چڑھتی آ رہی ہے۔ آسمان پر گھنگھور گھٹا چھا رہی ہو۔ اور ایسا اندھیرا کہ اندھیرے کے اوپر چڑھا جا رہا ہے۔ ایسا اندھیرا کہ اپنے ہاتھ باہر نکالیئے تو وہ بھی دکھائی نہ دے (یعنی دوسروں کا صحیح مقام متعین کرنا تو ایک طرف خود اپنا مقام بھی دکھائی نہ دے) دکھائی دے کیسے۔ دکھائی تو دین کی روشنی سے دینا تھا۔ جب دین خداوندی سے روشنی نہ لی جائے تو روشنی کہاں سے ملے؟ مذہب تو خود تاریکی ہے۔ تاریکی سے تاریکی ہی ملے گی۔ روشنی کیسے مل سکتی ہے۔ جب ہماری مسلمان قوم نے قرآن کریم پر ایمان لانے اور اسے ضابطہ حیات ماننے کے بعد عملاً اس سے دامن چھڑا لیا تو وہ کیونکر سربلند رہ سکتی تھی۔ قرآن نے صاف کہہ دیا ہے **کیف یھدی اللہ قوما کفروا بعد ایمانھم** بھلا خدا کا قانون اس قوم پر کسی طرح عروج و ارتقا کی راہیں کھول دے جو اس قانون کے درخشندہ نتائج پر ایمان لانے کے بعد اس سے عملاً انکار کر دے اور یہ کہ **واللہ لا یھدی للقوم الظلمین** اللہ کا قانون اس قوم پر سربلندی کا راستہ کبھی نہیں کھولتا جو حقائق کو اپنی جگہ نہیں رہنے دیتی۔ کیا ہمیں دکھائی نہیں دیتا کہ قرآن ان اور ان جیسی دوسری آیات میں ہماری داستان بیان کر رہا ہے وہ کہتا ہے **فاقصص القصص لعلھم یتفکرون** (7/176) انہیں ان کی داستان سناؤ تاکہ یہ سوچیں (کہ ہمیں کیا ہو گیا) سوچنا ہی تو ہم نے چھوڑ دیا ہم اپنی زبوں حالی پر نوحہ کرتے ہوئے یہی کہہ کر کہ ہائے اللہ تو نے یہ کیا کر دیا بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم نے **تتفکروا** پر عمل کیا ہوتا اور غور و فکر سے کام لیا ہوتا زندگی کے ہر معاملے میں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ کر قبول کرتے اور دیانت کے ساتھ ان کی ادائیگی میں کبھی پہلو تہی نہ کرتے جیسے ہم نے اپنا شعار زندگی بنا رکھا ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ہمارے اس دور میں بددیانتی اور غیر ذمہ داری اور صرف یہی دو بنیادی اور سنگین خرابیاں ہیں جن میں کم و بیش پاکستان سے متعلق پوری ملّتِ اسلامیہ مبتلا ہے اور اس کا نتیجہ ہمارے اس زوال کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ پھر اس پر سوال کرنا چہ معنی دارد۔ من حیث القوم ہم نے سب سے پہلی اور سب سے بڑی بددیانتی دین کے ساتھ کی کہ اسے مذہب میں بدل دیا۔ اور اس خود ساختہ مذہب نے ہمیں جو تن آسانیاں اور عقل و فکر سے عاری

ستے کی سہولتیں مہیا کر رکھی ہیں وہ کب ہمیں اللہ کے عطا کردہ دین کی گھاٹیاں چڑھنے دیتی ہیں۔ وہ تو ہمارا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔ خوئے بدرا بہانہ بسیار کا اطلاق ہم پر ہی تو ہوتا ہے۔ جب ہم اپنے معاشرتی روابط کے سلسلے میں مروّجہ رسوم و رواج اور طور طریقوں اور غمی خوشی کی تقریبات کا سہارا لے کر کہ جن کا قرآن کے دین سے یکسر کوئی تعلق نہیں دھڑلے سے یہ کہتے ہیں کہ بھئی کیا کریں ہم آخر ہمیں بھی دنیا میں رہنا ہے۔ ہم کیسے عزیز و اقارب اور دوست احباب کی ان معاشرتی باتوں (بدعتیں کہئے) سے الگ ہو سکتے ہیں۔ سچی بات ہے بھئی کہ دنیا اپنی جگہ اور دین اپنی جگہ چلئے جھگڑا ختم' یہی تو ہمارے مذہب کا طلسم سامری ہے جو اس نے خاص طور پر معاشرہ میں پھونک رکھا ہے اور ہم قرآن کے ساتھ سرا سر غیر قرآنی سلوک کئے جا رہے ہیں اور تاویلوں سے اسے پازند بنا رکھا ہے۔ قرآن عزیز تو سر تا سر ہدایت ہے۔ نور ہے لیکن جب قرآن کو دین کا ضابطہ سمجھا جائے اور اس کے تابع زندگی بسر کی جائے تو اس سے انسان کو ہدایت ملتی ہے برعکس اس کے جب اسے مذہب کی کتاب سمجھ لیا جائے۔ جس کا مقصد مردوں کو ثواب پہنچانا ہو تو اس طرح قرآن کو اس کے مقام سے ہٹا دینے والی قوم کے حصّے میں گمراہی اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اس قرآنی فیصلے کے بعد کیا ہم قرآن کے خدا سے گلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں؟ ہمیں اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ ہم مسلمانوں کے پاس خدا کا دین خالصتا" اپنی اصل شکل میں قرآن کریم کے اندر موجود و محفوظ ہے اس لئے اگر ہم ان اپنی پیدا کردہ پستیوں سے نکل کر زندگی کی بلندیاں اور عروج و کمال حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں موجودہ مذہب کی جگہ خدا کا دین بطور نظام حیات اور نظام مملکت اختیار کرنا ہو گا۔ ابھی وقت ہمارے ہاتھوں سے نکل نہیں گیا۔ مہلت کا وقفہ جاری ہے اور وقت کا کارواں رواں دواں ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے ناطے ایں و آں سے منہ موڑ کر اپنے ایمان کی طاقت پر سب سے پہلے موجودہ صورت احوال کو بدلنے کا عزم کریں۔ اللہ تعالیٰ سے اور اپنے دلوں سے یہ عہد کریں کہ آج سے ہماری کوشش یہ ہو گی کہ ہم معاشرتی' معاشی' اخلاقی' سیاسی ہر ہر حوالہ زندگی سے دیانت و صداقت کے ساتھ دین خداوندی کو اختیار کریں اور عصائے قرآنی کی بدولت مروّجہ اور وضعی مذہب اسلام کی کج مج پگڈنڈیوں اور ٹیڑھے میڑھے راستوں کو پاٹ ڈالیں۔ یقیناً وعدہِ خداوندی کے مطابق صراطِ مستقیم کے دروازے ہمارے لئے کھل جائیں گے۔ آخر میں میں شکر گزار ہوں آپ سب حاضرین کرام کی کہ آپ نے حقیقت سے متعلق میری اس تلخ نوائی کو ضبط اور سکون سے سنا اثر کرے نہ کرے آپ نے سن تو لی میری فریاد اور شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری (یعنی قرآنی) بات۔

(مضمون کنونشن 1993 میں پڑھا گیا)

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

سُود

موجودہ معاشی نظام اور اسلام

اللہ اس ملک کو سلامت رکھے، یہ اس برصغیر کے مسلمانوں کی جائے پناہ اور آخری سہارا ہے، درست ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر وجود میں آیا لیکن بغیر سمجھے کہ اسلام کے تقاضے کیا ہیں، ہر حکومت نے، ہر اتحاد نے جب اس پر مشکل وقت آیا، اسلام کے نام کا سہارا لیا اور جب مشکل وقت ٹل گیا، آنکھیں پھیر لیں۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک نے جو بنیادی طور پر "بھٹو ہٹاؤ" تحریک تھی، کامیابی کے لئے نظامِ مصطفےٰ تحریک کا لبادہ اوڑھ لیا اور جب ملک میں مارشل لاء لگ گیا تو نظامِ مصطفےٰ صرف بیانات تک محدود ہو گیا۔ دراصل کوئی بھی حکومت اسلام کو اس کی اصل روح کے مطابق، مساوات پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کی ہمت نہ پا کر ایک سہارے کے طور پر استعمال کرتی ہے اور بس! ضیاء الحق صاحب اسی کے سہارے اپنا اقتدار قائم کرنے میں اور پھر اسے قائم رکھنے میں مصروف رہے، جونیجو صاحب انہیں کے سائے میں قدم بڑھانے پر مجبور تھے اور جب انہوں نے اپنی مرضی سے پرواز کرنا چاہی، ان کے پر کاٹ دیئے گئے، بے نظیر پہ جو فردِ جرم لگی اس میں بھی اسلامی نظام قائم کرنے میں ناکامی کو ایک بڑا جرم گنوایا گیا۔ آئی جے آئی کی حکومت تو آئی ہی اس نام کے صدقے میں تھی، مگر اب شریعت کو نافذ کرنے کی دعویدار حکومت سود کے مسئلے پر ایک مشکل میں گرفتار ہے، اسے بحران سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا، ایک طرف مولوی حضرات کہ مذہب پہ اپنی اجارہ داری کے دعویدار ہیں اور دوسری طرف حکومت کے وزیر ہیں، کچھ معذرتی انداز لئے ہوئے ہیں۔

علماء حضرات کبھی نچلے نہیں بیٹھتے مگر مثبت اور ٹھوس کام ان میں سے کوئی بھی کرنے کو تیار نہیں، بس ایک رٹ ہے سود بند کرو، سود بند کرو۔ یہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ بے شک ایسا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں بتاتا کہ اس کے بغیر معیشت کو کن خطوط پر استوار کرنا ہوگا، دوسری قوموں سے کئے گئے معاہدوں کو ہم کس طرح یک طرفہ طور پر ختم کر سکتے ہیں، غیر مسلموں کو تو ہم قرآنی آیات پیش کر کے ان کے پیچھے پناہ نہیں لے سکتے ہیں کہ یہ آیات آج تو نہیں اتریں، اس وقت بھی تھیں جب آپ نے قرض لیا تھا اور ہماری شرائط کو قبول کیا تھا جن میں سود سرفہرست

تھا، یہ ہمارا تمہارا معاہدہ تھا اور معاہدات کی پابندی بھی آپ کی کتاب کے احکام میں ایک محترم حکم ہے۔

اندرونِ ملک بھی سارا کاروبار، ساری سرمایہ کاری جس کے بل پہ کارخانے بنتے اور چلتے ہیں، تجارت فروغ پا رہی ہے، سب سودی کاروبار ہے تو کیا یک قلم سارے بینک بند کر دیئے جائیں، ساری رقوم کھاتے داروں کو واپس کر دی جائیں؛ اس صورت میں علاوہ اس بات کے کہ لاکھوں لوگ بے روزگاری کے جہنم میں دھکیل دیئے جائیں گے اور بہت سی پیچیدگیاں سامنے آئیں گی۔

اس وقت جو ملکی حالات ہیں، معاشرے کی جو صورت ہے کون اس مال کو گھر میں رکھنے کی حماقت کر سکتا ہے، کیا دوسرے ہی دن یہ ساری رقوم چور، ڈاکو لوٹ چھین کر نہ لے جائیں گے، کیا اس کا علاج کسی مذہبی جماعت کے پاس ہے، وعظ نصیحت سے تو ڈاکو رُکنے سے رہے اور انتظامیہ تو اس معاملے میں پہلے ہی بے بس ثابت ہو چکی ہے اگر یہ رقوم واپس نہ کی جائیں تو کس کی تحویل میں رہیں اور کن شرائط کے تحت۔

جو لوگ اپنی ضروریات سے زاید کماتے ہیں، اڑھائی فیصد زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بچت کو کیا کریں، اگر وہ اس دولت کو عمر بھر جمع کرتے رہیں کہ دکھ تکلیف کے وقت، بڑھاپے اور معذوری کے وقت کام آئے گی یا پھر وراثت میں چھوڑ جائیں گے، تو آپ اس اکتنازِ زر کو کیسے درست ثابت کر سکیں گے، قرآنِ پاک میں متعدد جگہ دولت جمع کرنے کی مذمت کی گئی اور ایسا کرنے والوں کو سخت عذاب سے ڈرایا گیا ہے، کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن ان سکوں کو تپا کر ان کی پیشانیوں اور پشتوں کو داغا جائے گا اور اس طرح دولت کو منجمد کر کے رکھنے سے محرومیاں بڑھیں گی ہی، تو پھر کیا ہر کوئی اتنا ہی کمائے جتنا خرچ کرنا چاہتا ہو، فالتو نہ کمائے، اتنا ہی کام کرے، کیا اس سے قومی دولت میں کمی واقع نہ ہو گی۔

اپنی ضرورتوں کے لئے جمع کرنے کے سلسلے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر افراطِ زر کا یہی حال رہنا ہے، مہنگائی نے یہی جشن منانے ہیں تو بڑھاپے کے لئے بچائی گئی رقم کی حیثیت صلاحیت خرید اس وقت کیا ہو گی۔ ۱۹۶۰ء میں ۱۰۰ روپے کی حیثیت اور آج کی حیثیت کا فرق آج ہر کوئی لگا سکتا ہے، حاشا و کلا میں سود کے حق میں ایک لمحے کے لئے بھی سوچنے کو تیار نہیں، اس کے حق میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن جن باتوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، ان پہ سوچنا بھی کسی کا فرض ہے۔

مشکل یہ ہے کہ ہم نے ربا کا ترجمہ سود کیا ہے اور سود کو لین دین، ادھار، قرض، بینکنگ تک محدود کر کے خود کو بحث میں الجھا لیا اور اسی بینکنگ سسٹم کو اسلامائزیشن کے عمل سے گزارنے کی کوشش میں ہیں، کبھی بلا سود بینکاری کے اشتہار دیئے جا رہے ہیں، پی ایل ایس اکاؤنٹس شروع کئے جا رہے ہیں جس میں نقصان کی گنجائش ہی نہیں، سود کو مارک اپ اور ایسے ہی دوسرے نام دے کر لیپا پوتی کی کوشش کی جا رہی ہے اور پھر بعض "نابغہ روزگار" کی جانب سے نئے باب الحیل کے چکر میں قوم کو الجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس قسم کی باتوں سے ناسمجھوں کو بہلایا تو جا سکتا ہے، یہود و ہنود کے چنگل

سے نکالا نہیں جا سکتا۔

یہ سب حضرات جس بات سے صرفِ نظر کر رہے ہیں، وہ اور وہی اصل سوال ہے۔

اسلامی معاشی نظام کیا ہے؟ یہ جو اسلامی حکومت کا طرۂ امتیاز ہے کہ وہاں کوئی بھوکا ننگا نہ ہوگا، نہ بغیر چھت کے ہوگا، ہر ایک کو تعلیم اور علاج کے یکساں مواقع اور سہولتیں میسر ہوں گی، کوئی بڑھاپے اور معذوری میں خود کو تنہا اور بے سہارا نہ پائے گا۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں نہ کسی کو خوف ہوگا نہ حزن، وہ جو اکثر مثال دی جاتی ہے کہ اس معاشرے میں ایک تنہا عورت ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک، زیورات سے لدی سفر کر سکے گی اور اسے (سوائے خدا کے) کسی اور کا خوف نہ ہوگا۔

کہنے کو تو یہ سب کچھ کہہ دیتے ہیں، کوئی نہیں بتاتا کہ اس ملک میں اتنا ریونیو کیسے آئے گا، کہاں سے آئے گا، آج تو حکومتوں کی طرف سے اور ہماری جیسی نہیں، مالدار حکومتوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی حکومت سب کے لئے تعلیم کا، سب کے لئے علاج کا، بے کاری اور معذوری میں سہارے کا بندوبست نہیں کر سکتی، پرائیویٹ اداروں کو، بڑی بڑی کمپنیوں، کارپوریشنوں اور فاؤنڈیشنوں کو حکومت کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ فورڈ فاؤنڈیشن اور ایسے دوسرے اداروں کا حوالہ دیا جاتا ہے، ہمارے مذہبی طبقے بھی مال داروں کی طرف اسی نیت سے دیکھتے ہیں اور انہیں اگلی دنیا میں جنت کا حوالہ دیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ آج کا سرمایہ کار کارِ زمین، برسرِ زمین کا قائل ہے، وہ انکم ٹیکس بچانے کے لئے تو فری ہسپتال یا رفاہی ادارے میں پیسے لگا سکتا ہے اور جنت اس کے سوا (بطور سود) حاصل کرنا چاہتا ہے کہ یہی سرمایہ داری معیشت کا چلن ہے۔

مگر کیا یہ سب لوگ اپنے لئے آئیڈیل معیشت امریکی یا مغربی معیشت کو سمجھ رہے ہیں، کیا آپ کا معاشی نظام انہیں خطوط پر استوار ہوگا۔

اپنی زندگی کی آخری پبلک تقریب ـــ بینک دولت پاکستان ـــ کے افتتاح کے موقع پر قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:

> "ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو اسلامی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو، صرف یہی طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لے اور نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے، یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔"

ہاں یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا، اگر ہم نے وہ فریضہ احسن طریقے سے سرانجام دیا ہوتا، دنیا کو اسلامی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی معاشرہ قائم کر کے دکھا دیا ہوتا تو آج دنیا کی حالت مختلف ہوتی۔ اب ایک نظام کا انجام تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے، دنیا کی دوسری سپر پاور اپنی بے مثال سائنسی ترقی، لرزہ خیز فوجی قوت، وسیع رقبے

افرادی قوت کے باوجود ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، اس وجہ سے کہ اس کی معیشت نے آبادی کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ نہیں کہ اس کی آبادی یکایک بڑھ گئی تھی، ریسورسز بھی وہی تھیں مگر سسٹم نے جواب دے دیا تھا۔

ایک ضمنی سی بات اس میں سے یہ نکلتی ہے کہ اصل بات معاشی نظام، معیشت کی پائیداری اور قوت اور اس طرزِ حیات کا ہے اور اس فلسفے کا ہے جس پر وہ قائم ہے، سسٹم سے میری مراد یہی ہے، آج اگر پاکستان کی آبادی کسی آسمانی آفت، بیماری یا جنگ کی وجہ سے ۱۲ کی بجائے ۱۰ یا ۸ کروڑ رہ جائے تو کیا خوشحالی کی منزل کے قریب تر ہو جائیں گے۔ وسائل اور آبادی کی اہمیت اپنی جگہ مگر اصل بات کچھ اور ہے، اگر آبادی یہی رہے۔ آئندہ دس سال بھی اور نظام یہی جاگیرداری اور سرمایہ داری پر مبنی کارخانہ داری، اجارہ دار..... تو ہم خوشحالی کی منزل سے قریب تر نہ ہو جائیں گے، ملک ایسا ہی بدحال رہے گا، معیشت اتنی ہی واماندہ۔

یہ باتیں سوچنے کی ہیں مگر جس قوم نے اپنے اوپر سوچ کے دروازے بند کر رکھے ہوں اور ان دروازوں کو بند رکھنے کو مذہبی تقدس اور تائید حاصل ہو وہاں کوئی کیا کرے۔

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

سوویت یونین کے منظرِ عام سے ہٹ جانے سے چھوٹے، پس ماندہ، غریب ملکوں کے غریب اور بدحال لوگوں پہ کیا اثرات ہوں گے، یہ سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اب امریکہ بہادر دنیا میں جمہوریت کا ٹھیکیدار بنا بیٹھا ہے، اس وقت وہ لیبیا، ایران، پاکستان، بلکہ چین تک کو جمہوریت کا درس دے رہا ہے، بھارت کے لئے محض اس وجہ سے اس کے دل میں نرم گوشہ ہے کہ اس کے خیال میں وہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوری حکومت ہے۔

ہمارے ہاں بھی ساری جدوجہد جمہوریت کے قیام کے لئے ہے، اس قسم کی جمہوریت اور سرمایہ داری نظام لازم و ملزوم ہیں، اس قسم کی جمہوریت میں پارلیمنٹ میں، انہیں آپ کوئی بھی نام دے لیں، سرمایہ دار طبقے ہی کی اجارہ داری ہو گی، ان حالات میں کوئی بھی تصور نہیں کر سکتا کہ ایسی اسمبلی معرضِ وجود میں آ سکتی ہے جو جاگیرداروں، زمینداروں، سرداروں، سرمایہ داروں اور خوانین کو کہہ سکے

وہ خدایا یہ زمین تیری نہیں، تیرے آبا کی نہیں

جو بادشاہوں کو للکار سکے

بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

اوّل تو ایسا معجزہ رونما ہو نہیں سکتا اور اگر یہ کسی حد تک ہی سہی ممکن ہو بھی جائے تو زمین اور زمین میں چھپے خزانے عوام کی نہیں، امت کی نہیں، بیوروکریسی کی تحویل میں آ جائیں گے جیسے قومیانے کے نام پر ہوا اور اس کا جو انجام ہوا،

سب نے دیکھا، بیوروکریسی کی ٹریننگ، کردار کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ ایسی اصلاحات کا انجام اس سے مختلف اور ہو بھی نہ سکتا تھا، روس کا جو انجام ہوا وہ بھی دراصل اسی بیوروکریسی کا کیا دھرا ہے جو اپنی اساسی فلاسفی اپنے قیام کے ذمہ دار فلسفے سے بے گانہ ہو چکی تھی اور جس کے پاس کوئی ضابطۂ حیات اور ضابطۂ اخلاق نہ تھا۔ بس اختیار ہی اختیار اور طاقت ہی طاقت تھی۔

پھر کیا کیا جائے، چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرما۔

ہم اس زمانے میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم جمہوریت نہیں چاہتے یا ہم جمہوریت کے مخالف ہیں۔ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ مسلمانوں سے زیادہ جمہوریت پسند کون ہو سکتا ہے۔ یقیناً ان کے پیشِ نظر وہ قرآنی آیات تھیں جن میں کہا گیا ہے کہ وہ (یعنی مومنین) اپنے معاملات باہمی مشوروں سے طے کرتے ہیں (وامرھم شوریٰ بینھم) اور نبی کریمؐ سے یوں کہا گیا وشاورھم فی الامر۔ معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کریں۔

جمہوریت کو ہم اپنے رنگ میں، اپنے حالات کے مطابق نافذ کرنا چاہتے ہیں، آج بھی جمہوریت مختلف ممالک میں مختلف شکلوں میں رائج ہے، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی سب میں قیامِ حکومت کا انداز مختلف ہے لیکن سب اپنے آپ کو جمہوری ملک کہتے ہیں، ہم بھی یہی کرنا چاہتے ہیں، ہمارے ہاں تعلیم کم ہے، معاشی حالات مختلف ہیں، طبقات میں بہت تفاوت ہے، روپیہ پیسہ، مذہبی جذباتی ماحول انتخاب پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ برطانوی پارلیمانی روایات کے مطابق چنے گئے نمائندے ہمارے ملک کے لوگوں کی سچی نمائندگی نہیں کرتے۔ آپ دیکھ لیجئے ہماری اسمبلی میں سینکڑوں نمائندے بیٹھتے ہیں، ان میں سے نچلے طبقوں کے نمائندے کتنے ہیں، درمیانے طبقوں کے کتنے اور اوپر کے طبقوں کے کتنے، کیا یہ نمائندگی ان طبقوں کی آبادی کے تناسب سے ہے؟ ہر کوئی جانتا ہے اسمبلیوں تک پہنچنا پیسے کا کھیل ہے اور اب تو ایک ایک نمائندہ اتنے پیسے خرچ کر کے اسمبلی میں پہنچ پاتا ہے کہ نچلے اور درمیانے طبقے کا شخص اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور یوں عملاً ساری کی ساری نمائندگی اوپر کے طبقے کے پاس ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اپنے ہی طبقے کے مفادات کے تحفظ کے لئے قوانین بنائیں گے۔ تعلیم بھی انہی کو میسر ہے، اسی لئے سول اور فوج میں بھی اونچے عہدوں پر انہی کی اجارہ داری ہے اور اب تو یہ طبقے رشتہ داریوں کے بندھنوں میں بندھ کر عوام کے لئے ایک جال کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔

ضرورت ہے اسمبلیوں میں طبقات کے مطابق نمائندگی ہو، اگر ہم یہ مطالبہ کریں تو یقیناً یہ غیر جمہوری مطالبہ نہیں ہوگا اور جب اسمبلیوں میں کم از کم ۸۵ فی صد نمائندے غریب طبقے سے ہوں گے، ۱۰ فیصد درمیانے طبقے سے اور ۵ فیصد نمائندے اوپر کے طبقے سے تو اسمبلیاں صحیح نمائندہ اسمبلیاں کہلا سکیں گی اور سب طبقات کے مفادات کو مدنظر رکھ سکیں گے، نہ بیوروکریسی استحصال کر سکے نہ اوپر کے طبقے کوئی دھونس جما سکیں گے۔ یہ لوگ تعلیم کو عام لوگوں تک پہنچا سکیں گے، نچلے طبقے کو معیاری تعلیم کی سہولتیں دے کر ان کی علمی سطح بلند کر کے ملکی حالات کو سلجھانے کی صورت پیدا ہو سکے گی، ان صلاحیتوں سے

قومی دولت بڑھے گی، کبھی آپ نے غور کیا کہ ملک میں کتنی ریسورسز ابھی سربمہر بیکار پڑی، مادی کے علاوہ ذہنی صلاحیتوں کا معاملہ بھی توجہ کے قابل ہے، ۸۰ فیصد وہ بچے جو سکول تک نہیں پہنچ پاتے کیا اللہ تعالیٰ نے ان کو دماغ نہیں دے رکھے، کیا ان کے اندر بے انتہا صلاحیتیں نہیں ہیں جنہیں بروئے کار آنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں تو وہ قومی دولت کو بڑھانے میں فعال کردار ادا کر سکیں، قدرت نے ساری صلاحیتیں اس وقت کے برسر اقتدار طبقے اور اس کی اولاد کے لئے تو مختص نہیں کر رکھیں، انہوں نے بس غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے، خدا معلوم اس غاصبانہ قبضے کے باعث کتنے عبدالقدیر سامنے نہ آ سکے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کو کیا نہیں دے رکھا، زرخیز زمین، بہتے دریا، زیرِ زمین تیل، گیس، معدنی دولت، قیمتی دھاتیں، بیش بہا پتھر اور ایک ایسی جفاکش، محنتی قوم کہ غیر ملکوں میں جا کر صحراؤں کو گلزار بناتی ہے، اگر ان کے دست و بازو پہ بھروسہ کیا جائے، انہیں اور کچھ نہیں تو ان کی محنت کی قدر اور انہیں عزت و تکریم دی جائے تو یہ قوم معجزے برپا کر کے رکھ دینے کی صلاحیتیں رکھتی ہے، ان کی محنت سے جو کچھ تعمیر ہوگا وہ پائیدار بھی ہوگا اور نسبتاً بہت کم خرچ پہ باہر کے قرضوں سے یہی ایک بات نجات دلا سکتی ہے، باہر کا قرض قوم کو احساس کمتری ہی کا شکار نہیں کرتا قوم کو تن آسان اور بے راہ رو بھی کرتا ہے اس نے ایک مصنوعی خوشحالی دی ہے جو بہت بڑی خود فریبی ہے۔ اگر یہ غیر ملکی قرضے جو امداد کہہ کر دیئے جاتے ہیں اور دراصل بہت بڑے سودی قرضے ہیں، نہ ہوتے تو کیا ترقی نہ ہوتی، میں مانتا ہوں کہ اگر یہ غیر ملکی امداد نہ ملتی تو شاید ترقی کے یہ مناظر جنہیں میں مصنوعی کہتا ہوں، دیکھنے کو نہ ملتے، اوپر کے طبقے میں روپے کی ریل پیل، لمبی لمبی نئے ماڈل کی کاریں، فائیو سٹار ہوٹلوں میں نظر آنے والی مخلوق کے لالے تلے نظر نہ آتے اور نہ ہی اس دور کے مغل شہزادوں کی وسیع و عریض سنگِ مرمر سے ڈھکی اور غیر ملکی سامان سے آراستہ کوٹھیاں دیکھنے کو ملتیں، قوم کے تن پر لباس فاخرہ نہ ہوتے، لوگ سیدھے سادے سے عام سے کپڑے پہنتے، معمولی گھروں میں رہتے مگر پاکستانی قوم کے سر غیروں کے احسانات اور کندھے قرضوں کے بوجھ تلے جھکے نہ ہوتے۔

اَن کمائے، باہر سے ملے ہوئے اس سرمائے نے ملک کی معیشت کا تو جو حال کیا سو کیا اس ملک کی افسر شاہی اور سماج میں رشوت اور کرپشن کو جو عام کیا ہے، اخلاق کا جو حلیہ بگاڑا ہے وہ سب کے سامنے ہے، اس سودی امدادی روپے نے قرآن پاک کے اس ارشاد کی سچائی کیسے آنکھوں کے سامنے سچ کر کے دکھا دی ہے کہ

"ربٰوا جسے تم سمجھ رہے ہو اپنے روپے کو بڑھانا ہے، بڑھانا نہیں درحقیقت ضعفٌ ..... یعنی کم کرنا ہے۔" (۳/۱۲۹)

ربٰوا سے معاشرے کی دولت بڑھتی نہیں کم ہوتی ہے، سود خور کے کمانے کی صلاحیتوں میں کمی ہو جاتی ہے، اس سے قومی معیشت گھٹتی ہے۔ ربٰوا سے افراد کے کمانے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں اور قومی دولت میں کمی آ جاتی ہے۔

بلاسود بینکنگ کا تو ہم نے بڑا چرچا کیا مگر بلاسود معاشرت اور بلاسود معیشت پہ کبھی نہیں سوچا، نہ علما نے، نہ معیشت دانوں

نے، نہ سیاسی رہنماؤں نے، اس لئے کہ یہ ان کے کسی بھی مفاد میں نہیں، ان میں اتنی اخلاقی جرأت ہی نہیں کہ اس مضمون پہ سوچ سکیں۔ علامہ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ

"اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو کسی موزوں شکل میں قبول کرنا اور اسے اسلامی قانون کے مطابق زیرِ عمل لانا حقیقت میں اسلام سے انحراف نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹنے کے مترادف ہوگا۔"

تو اسی طرف اشارہ کیا تھا، یہ حقیقت ہے کہ بلاسود معاشرہ اشتراکی معاشرہ ہو سکتا ہے جس میں زمین پہ ملکیت کے تصور کا خاتمہ ہے۔ زمین اور زمین کے اندر موجود تمام خزانے تمام انسانوں کے لئے یکساں کھلے ہے

باطن الارض للہ ظاہر است
آنکہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

کہنے کی جرأت اقبالؒ ہی کر سکتا تھا۔

سوال اس فلسفے کا رہ جاتا ہے جس کے ماتحت یہ معاشرہ وجود میں لایا جاتا ہے، خدا کی نفی کرنے والا لادینی معاشرہ یا دینی ہدایت کے تحت قائم کیا گیا معاشرہ، علامہ نے یونہی تو روس سے نہیں کہا تھا کہ ے

اے کہ می خواہی نظامے عالمے
جستہ ای او را اساسِ محکمے

تصور میں لائیے اس دینی معاشرے کو جس میں ہر شخص لیس للانسان الا ما سعٰی کی روح کو سمجھتے ہوئے اپنی پوری پوری جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر مصروفِ تگ و تاز رہے گا۔ اپنا فرض سمجھ کر زیادہ کمائے گا اور یسئلونک ماذا ینفقون کے تحت محض اپنی ضروریات کے مطابق اپنے لئے رکھ کر باقی سارے کا سارا ملت کی فلاح کے لئے کھلا رکھے گا اور جب ایسی قرآنی حکومت ہوگی، تو اس کے اربابِ اختیار کی تحویل میں دے دے گا..... تو اپنی جان، مال سب کچھ اپنے اللہ کے ہاتھ بیچ چکا ہوتا ہے اور اللہ اس کے بدلے میں اسے جنت کا وعدہ کرتا ہے (اِنَّ اللہ اشترٰی من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ) اس دنیا میں ایک جنتی معاشرہ اور عاقبت میں بھی جنت جس کی نعمتوں کا شمار ہی نہیں۔

اگر آپ ایسی جماعت پیدا کر لیتے ہیں اس خطۂ زمین میں جو بذاتِ خود اللہ کی طرف سے ایک نعمت ہے جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔ تصور کیجئے کروڑوں ہاتھوں، کروڑوں دماغوں کی محنت کا ماحصل، کوئی ایسی سٹیٹ کی امارت اور اس کے وسائل کا اندازہ کر سکتا ہے، کتنی دولت ہوگی اس اسٹیٹ کے پاس جسے وہ اولاً اپنے لوگوں اور ثانیاً خلق خدا کی بہتری کے لئے استعمال کرے گی

یہ سٹیٹ سب کی تعلیم، سب کی رہائش، سب کے علاج، سب کی معذوری اور بڑھاپے میں سامانِ زیست کی بہم رسانی کی ذمہ داری قبول کرے گی، سب کو رزق (اور وہ بھی رزقِ کریم) مہیا کرے گی، کسی فورڈ فاؤنڈیشن کی مدد کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہم دنیا کے لئے خود کفالت کی مثال بن کر دکھا سکتے ہیں اور اس طرح قائدِ اعظمؒ کے فرمان کے مطابق اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لے اور نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے۔

ضرورت ہے کہ بلا سود بینکاری اور بے کار کی فقہی موشگافیوں کے مرحلوں سے اوپر اٹھ کر ہم ایک بلا سود معیشت اور مساوات پر مبنی معاشرت کے قیام کی کوششیں شروع کر دیں، یہی ہمارے لئے نئے سوشل کنٹریکٹ کی راہ ہے۔

ہم بچاتے رہ گئے دیمک سے اپنے گھر مگر
چند کیڑے کرسیوں کے ملک سارا کھا گئے

(حسنین بخاری)

قارئین طلوع اسلام کو

عید مبارک ہو۔

مدیران طلوع اسلام

☆... تحریر: عبداللہ ثانی
ایڈووکیٹ

اسلام اور سپریم کورٹ

اسلام میں ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ اس لئے کہ بااختیار ہے۔ اعمال کی یہ ذمہ داری کسی بھی طور نہ تو کسی ادارے کی طرف منسوب کی جاسکتی ہے اور نہ ہی انسانی اعمال کی ذمہ داری کسی ادارے پر ڈالی جاسکتی ہے۔ بالفاظ دیگر انسان اپنے اعمال کے حوالہ سے خود ہی ایک ادارے کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ جو عمل بھی کرے گا اسی کے لئے جواب دہ ہو گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اعمال تو انسان کرے اور بری الذمہ یا سزا کا مستوجب ادارہ ہو۔ اعمال کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے انسانوں نے اداروں کے وجود کو تسلیم کیا ہے اور یہ جواز پیدا کیا ہے کہ ادارے کا تسلسل قائم ہے لہٰذا ادارہ زندہ جاوید ہے انسان آتے جاتے رہتے اور رہیں گے۔ اس طرح ادارہ یا جسے عام اصطلاح میں INSTITUTION کہا جاتا ہے قائم و دائم رہے گا ۔ یہ تصور سراسر غیر قرانی لہٰذا غیر اسلامی ہے۔ ذرا غور کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ کسی بھی ادارے کا وجود انسان ہی کی وجہ سے ہے اگر انسان کو ادارے سے علیحدہ کر دیا جائے تو ادارے کا وجود خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ بغیر انسان کے کوئی بھی ادارہ ایک Abstract حیثیت کی شے بن جاتا ہے۔ یہ انسان ہی ہے جس نے ادارے کی مجرد حیثیت کو ختم کر کے ایک حقیقی حیثیت کے طور پر تسلیم کروایا ہے۔ اس حقیقت کو مزید واضح کرنے کے لئے پورے قرآن کریم کو اٹھا کر دیکھئے اس قسم کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ قران کریم خداوندِ لم یزل کی طرف سے بنی نوع انسان کے نام آخری پیغام ہے۔ اس کے نزول سے قبل ایک یا چند اداروں کی علامت کے طور پر دو چار نام یقیناً قرآن کریم میں ملتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے اعمال کی ذمہ داری انفرادی طور پر ان کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ مثلاً فرعون جاگیرداری نظام کی ایک علامت ہے تو ہامان مذہبی پیشوائیت کا نشان' قارون نظام سرمایہ داری کا نمائندہ ہے تو نمرود جبر و استبداد کا مظہر۔ بظاہر یہ چار مختلف ادارے ہیں اور ان کی نمائندگی چار مستبد قوتیں کر رہی ہیں لیکن اس کے باوجود قران کریم میں ان کو کسی بھی ادارے کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ آویزش حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا مقصود درحقیقت مستبد قوتوں کے خلاف اس داعی انقلاب کی معرکہ آرائیوں کا بیان ہے جو وحی کی روشنی میں انسانی حکومت کی جگہ خدا کی حکومت تحت اجلال دنیا میں بچھانا چاہتا ہے۔

اب اگر ایک طرف ادارے کو قران کریم نے خارج از بحث قرار دے دیا ہے تو دوسری طرف انفرادی طور پر انسان کو اپنے (خدا) کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہنے کا پابند کر دیا گیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ خود خداوند کریم نے اپنے آپ کو بھی اپنے بنائے ہوئے قوانین کا پابند کیا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان قوانین سے روگردانی پر انسان کو انفرادی طور پر سزا یا جزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح نہ تو خدا کے ہاں کسی تسلسل پر مبنی ادارے کا وجود ہے اور نہ ہی اس نے انسان کو اعمال سے بری الذمہ ہونے کے لئے کسی ادارے کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ یہ تصوّر انسان کا پیدا کردہ ہے۔ جو دراصل مغربی انداز فکر کی پیداوار ہے۔ اس طرح مغرب نے مذہب کی طرف سے بداعمالیوں پر عائد پابندیوں سے بچنے کے لئے گریز کی راہ تلاش کی ہے۔ یاد رہے کہ مذہب انسان کا پیدا کردہ ہے جبکہ دین خدا کی طرف سے متعین ایک نظام کا ہے جس میں ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ مذہب حیلہ جو ہے جبکہ دین اس سے مبرّا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قران کریم کے نزدیک انفرادی توہین کا ارتکاب تو ہو سکتا ہے ادارے کی توہین کا کوئی جواز نہیں۔ جب وہ (اللہ تعالیٰ) کہتا ہے کہ

و لقد کرمنا بنی ادم (17/70)

ہم نے تمام فرزندان آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔ (یہ تکریم بلا لحاظ رنگ۔ نسل۔ خون۔ مٹی یا جغرافیائی تخصیص کے ہے) تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔

یوم ندعوا کل اناس بامامھم فمن اوتی کتبہ بیمینہ فاولیک یقرءون کتبھم و لا یظلمون فتیلا (17/71)

مفہوم :- (انسان نہ تو محض اس کے طبعی جسم سے عبارت ہے اور نہ ہی اس کی جولانیوں اور کامرانیوں کا میدان صرف طبیعی کائنات ہے۔ حیوانی زندگی کے علاوہ اس کی "انسانی زندگی" بھی ہے جو اس کے اعمال کے مطابق مرتّب ہوتی ہے۔ 12/15)- اعمال کے نتائج کے ظہور کے وقت تمام انسانوں کو' ان کے اعمالنامے کے ساتھ بلایا جاتا ہے۔ جس کا اعمالنامہ اس کے دائیں ہاتھ میں ہوتا ہے (کہ یہ یمین اور سعادت کا نشان ہے) تو یہ لوگ اسے (خوشی خوشی) پڑھتے ہیں اور اس میں اپنے تمام اعمال کا پورا پورا بدلہ موجود پاتے ہیں۔ اس میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں ہوتی"

ظاہر ہے' قیامت کے دن اس کی گلو خلاصی اس لئے نہیں ہو گی کہ وہ کسی ادارے یعنی INSTITUTION کا نمائندہ تھا اور وہ اپنے فیصلے غیر اسلامی قوانین پر کرنے کا مکلّف تھا۔ چنانچہ قران کریم نے یہ ابہام دور کرنے کے لئے کہہ دیا کہ :-

و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون (5/44)

جو شخص اس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے وہ کافر ہے۔ (خواہ وہ زبان سے اس قانون پر ایمان رکھنے کا دعویٰ بھی کیوں نہ ہو۔ کافر اور مومن کی تمیز ہی اس سے ہوتی ہے۔)

و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظلمون (5/45)

جو شخص اس ضابطہ قوانین کے مطابق فیصلے نہ کرے جسے خدا نے نازل کیا ہے تو یہی لوگ ہیں جو حق و انصاف سے کام نہیں لیتے، ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔

و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفسقون (5/47)

جو لوگ اس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے جسے خدا نے نازل کیا ہے تو ان کا شمار فاسقین میں ہوتا ہے یعنی صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کرنے والے۔

ان تینوں آیات میں "جو شخص" یا "جو کوئی" سے آیت شروع ہوتی ہے۔ جس سے مراد انسان کی انفرادی حیثیت بطور حاکم یا قاضی یا جج کے طے شدہ ہے۔ وہ کسی ادارے کے نمائندہ کے طور پر بھی اگر کوئی فیصلہ کرے تو بھی اس کا یہ فیصلہ جج یا منصف باالذات کے نامہ اعمال میں ڈالا جائے گا۔ ادارے کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

آیئے! ذرا انفرادی اعمال کے متعلق قران کریم سے پوچھتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

اقرا کتبک کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا (17/14)

اور انسان سے کہا جاتا ہے کہ لو! اپنا نامہ اعمال خود پڑھ لو۔۔۔ تمہارا حساب کرنے کے لئے باہر سے کسی محاسب کے بلانے کی ضرورت نہیں، خود تمہاری اپنی ذات، تمہارے خلاف، محاسبہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

الذین تتوفھم الملئکۃ طیبین یقولون سلم علیکم ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون (16/32)

یعنی ان لوگوں کے حسن عمل کا کہ (ان کی زندگی تو ایک طرف) ان کی موت بھی نہایت خوشگوار اور اطمینان بخش ہوتی ہے۔ ملائکہ انہیں امن و سلامتی کی خوش خبریاں دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ تم اپنے اعمال کے بدلے میں جنت میں رہو سہو۔

من عمل صالحا من ذکر او انثی و ھو مومن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ و لنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون (16/97)

یاد رکھو! اس باب میں ہمارا قانون یہ ہے کہ تم میں سے جو بھی بلا تفریق جنس، نظام خداوندی کی صداقت پر یقین رکھ کر ایسے کام کرے گا جو اس کی ذات اور معاشرہ کو سنوار دیں، تو ہم اسے نہایت خوشگوار زندگی بسر کرائیں گے۔ یہ نتیجہ ہو گا ان کے اعمال کا جو ان سے حسن کارانہ انداز سے ظہور میں آئیں۔

جزاء بما کانوا یعملون (56/24)

یہ سب آسائشیں اور سرفرازیاں، ان لوگوں کے اپنے اعمال کے نتائج ہوں گے۔

غرض انفرادی اعمال اور ان کے ظہور نتائج کے وقت دئے جانے والے ثمرات کو اگر دیکھا جائے تو کہیں بھی

۔۔ارے کی صورت سامنے نہیں آتی۔ یہاں تک کہ جب انفرادی اعمال اس حد تک بگڑ جائیں کہ سنوارنے کی کوئی صورت نہ ہو تو پھر اجتماعی عذاب نازل ہوتا ہے۔ اعمال کے لئے ملاحظہ ہو۔ 7/43، 6/128، 10/62-64، 6/133، 6/75، 20\
9/19-21، 46/19، 23/51، 34/11، 11/46، 41/46
45/15، 67/2، 58/11 - اس کے علاوہ بھی کئی مقامات پر انفرادی اعمال کا ذکر موجود ہے۔

قران کریم میں ایک ایسی آیت بھی ہے جس سے ایک ہلکا سا تاثّر اجتماعی زندگی کا بطور ادارہ سامنے آتا ہے۔ لیکن اس تاثر کو یکسر ختم کرنے کے لئے فوراً" کہہ دیا کہ تم میں سے اللہ کے نزدیک واجب التکریم وہ ہے جو اس کے قوانین پر کاربند ہو"

یاایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی و جعلنکم شعو باو قبائل لتعار فو اان اکر مکم عند اللہ اتقکم ان اللہ علیم خبیر (49/13)

مفہوم :- ہم نے انسانوں کو مرد اور عورت کے اختلاط سے پیدا کیا ہے۔ (جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسانی بچے میں --- خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی --- کچھ حصہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ عورت کا۔ اس لئے یہ سمجھنا غلط ہے کہ مرد' عورتوں سے افضل ہیں یا عورتیں مردوں سے الگ ہیں) باقی رہے مختلف خاندان یا قبیلے تو اس سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں آسانی ہو۔ ورنہ' نہ کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ سے افضل ہے نہ کوئی خاندان کسی دوسرے خاندان سے معزز۔ میزانِ خداوندی کی رو سے' عزّت اور تکریم کا صرف ایک معیار ہے اور وہ یہ کہ تم میں سے کس کی زندگی قوانینِ خداوندی سے زیادہ مطابق ہے۔ کون ان کی زیادہ اطاعت کرتا ہے۔ جس کی زندگی زیادہ سے زیادہ اس معیار پر پوری اترتی ہے' وہی سب سے زیادہ واجب التکریم ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت یا کسی خاندان یا کسی قبیلے میں پیدا ہوا ہو۔ یہاں معیار افضیلت' حسب و نسب نہیں۔ ذاتی جوہر اور سیرت و کردار کی بلندی ہے۔ یہ بات وہ خدا کہہ رہا ہے جو اچھی طرح جانتا ہے کہ افضیلت کسے کہتے ہیں اور وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

یاایھا الذین امنو الا یسخر قو م من قو م عسٰے ان یکو نو اخیرامنھم و لا نساء من نساء عسٰی ان یکن خیرا منھن و لا تلمز و انفسکم و لا تنابز و بالالقاب بلس الا ثم الفسو ق بعد الا یمان و من لم یتب فاو لئک ھم الظلمون

یاایھا الذین امنو اجتنبو ا کثیر ا من الظن ان بعض الظن اثم و لا تجسسو او لا یغتب بعضکم بعضاایحب احد کم ان یا کل لحم اخیہ میتافکر ھتموہ و اتقو اللہ ان اللہ تو اب ر حیم (49/11-12)

مفہوم :- (باہمی اختلاف کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف' نفرت اور حقارت کے جذبات

مشتعل ہونے لگتے ہیں۔ جن کا اظہار بڑی ناپسندیدہ حرکات سے کیا جاتا ہے۔ یاد رکھو! تم ایسے اتفاقی اختلاف کے وقت' اس قسم کی حرکتیں نہ کرنے لگ جانا۔ مثلاً یہ نہ ہو کہ) تم میں کا ایک فریق' دوسرے فریق کا مذاق اڑانے لگ جائے اور اسے ذلیل اور حقیر کرنے کی کوشش کرے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ تمہاری پارٹی کے لوگوں سے بہتر ہوں ——— نہ تمہارے مرد یہ کچھ کریں۔ نہ عورتیں۔ نہ ہی تم ایک دوسرے کے خلاف عیب لگاؤ نہ طعن و تشنیع کرو۔ نہ ایک دوسرے کے الٹے پلٹے نام رکھو ——— جب تم ایمان لا کر' بلند اخلاق کے حامل بننے کا تہیّہ کر چکے ہو تو پھر آپس میں ایک دوسرے کے برے نام رکھنے سے کیا مطلب؟ یہ بڑی بری بات ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا ہے تو اسے اپنے کئے پر نادم ہو کر فوراً اس روش کو چھوڑ دینا چاہئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو وہ قانون خداوندی کی نگاہ میں مجرم قرار پائے گا۔

(جب باہمی اختلاف ہو جائے تو اس سے فتنہ پرور لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور فریقین میں لگائی بجھائی کی باتیں کرتے ہیں۔ تم اس باب میں بڑے محتاط رہو۔ تم ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ حسن ظن سے کام لو اور بدگمانی سے اجتناب کرو۔ بعض بدگمانی ایسی ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کے متعلق خیر سگالی کے تمام جذبات مضمحل کر دیتی ہے (حالانکہ وہ محض بدگمانی ہوتی ہے' اور درحقیقت ایسا نہیں ہوتا) نہ ہی تم خواہ مخواہ ایک دوسرے کے راز کی باتوں کی ٹوہ لگاؤ اور نہ ہی ایک دوسرے کی غیبت کرو کیا تم اسے پسند کرو گے کہ تم! اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاؤ۔ اس سے تو تمہیں سخت گھن آئے گی۔ (سو غیبت کی بھی ایسی ہی مثال ہے۔)

المختصر تم ہر معاملہ میں قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور اگر کہیں غلطی کر بیٹھے ہو تو اس سے نادم ہو کر اپنی اصلاح کر لو اس طرح قانون خداوندی تمہاری لغزش سے درگزر کرے گا اور تمہاری نشوونما میں کمی نہیں آنے دے گا۔

جن معاشرتی برائیوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان کا جذبہ محرکہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھنے اور دوسروں کو حقیر بنانے کی کوشش کرتا ہے یہی جذبہ انسانی زندگی کے اور گوشوں میں بھی کارفرما ہوتا ہے۔ مثلاً مردوں نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ وہ عورتوں سے افضل ہیں یا بعض خاندان نسبی طور پر اپنے آپ کو دوسروں سے معزّز تصوّر کرتے ہیں۔ بہرحال یہ اپنے طور پر ایک علیحدہ موضوع ہے۔

اب اگر انفرادی اعمال کی یہی صورت حال ہے اور خدا کے نزدیک بھی جزا اور سزا کا تعین انفرادی اعمال کے نتیجے میں کیا جائے گا تو اس صورت میں کسی ادارے کی توہین یا بلا ضرورت تکریم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن کریم کے نزدیک انسانیت کی تکریم تو ہو سکتی ہے کسی ادارے کی کسی صورت میں بھی نہیں۔

اب اگر ادارے سے بات نکل کر انفرادی حیثیت پر آگئی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ توہین کس کی ہوئی

ہے۔؟ اگر اس کا تعین کر لیا جائے کہ جس کی توہین ہوئی ہے اسے بھی سامنے لایا جائے اِس طرح انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں گے۔ اور یہ حق بھی صرف اسے ہی حاصل ہے کہ اپنی توہین کی داد رسی مانگے۔ جس نے توہین کی ہے وہ اور فریق مخالف یعنی مدعی اور مدعا علیہ کو بالمقابل انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے۔ اگر انسانی ذات کے حوالے سے قرآن کریم کے مطابق دونوں کی حیثیت توہین ثابت ہونے سے قبل ایک ہی ہے تو میزان کا تقاضا یہ ہے کہ **والسماء رفعھا و وضع المیزان الاتطغوا فی المیزان واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان** (55/-8-9)

مفہوم: اس قانون کے سامنے جس کی رو سے اس نے تمام اجرام فلکی کو فضا کی پہنائیوں میں' اس انداز سے رکھا ہے کہ ان کے باہمی ربط و ضبط کے لئے جس توازن کی ضرورت ہے اس میں ذرہ برابر فرق نہیں پیدا ہونے پاتا ——— یہ قرآن' انسانوں کو بھی اسی غرض کے لئے دیا گیا ہے کہ ان کے معاشرے میں باہمی ربط و ضبط کے لئے جس توازن کی ضرورت ہے' وہ بگڑنے نہ پائے۔ یعنی تم اس توازن کو عدل اور انصاف کے ساتھ قائم رکھ سکو' اور کسی کے حقوق و فرائض میں کسی قسم کی کمی و بیشی نہ کرو۔

دوسرے مقام پر ارشاد خداوندی ہے:

یایھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم او والدین والاقربین ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولی بھما فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا وان تلوا او تعرضوا فان اللہ کان بما تعلمون خبیرا 4/135

مفہوم: (اس نظام کے قیام کے لئے' جس میں حال اور مستقبل دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں' بنیادی شرط یہ ہے کہ تم دنیا میں عدل و انصاف کے محافظ و نگران بن کر رہو۔(8/5) عدل کے لئے ایک بنیادی عنصر سچی شہادت ہے۔ تم شہادت نہ مدعی کی طرف سے دو نہ مدعا علیہ کی طرف سے' تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر کھڑے ہو اور ہمیشہ عدل و انصاف کو مدنظر رکھ کر سچی سچی شہادت دو۔ خواہ یہ شہادت (اور تو اور) خود تمہارے اپنے خلاف جائے یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف۔ اس باب میں امیر اور غریب میں بھی کوئی امتیاز نہ کرو (حتیٰ کہ دشمن سے بھی عدل کرو۔ 8/5) تم جادہ حق و صداقت سے ہٹ کر' ان کے خیر خواہ مت بنو۔ خدا کو ان کی خیر خواہی کی زیادہ فکر ہے۔ اس کا خیال رکھو کہ تمہارے جذبات کہیں عدل کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں۔ نہ ہی کوئی پیچیدار بات کرو۔ نہ شہادت دینے سے پہلو تہی کرو۔ یاد رکھو! اللہ کا قانون مکافات تمہارے تمام اعمال (جذبات و رجحانات تک) سے اچھی طرح واقف ہے۔

اس آیت کو سامنے رکھ کر حقوق و فرائض کا تعین مشکل نہیں۔ اس طرح اگر حقوق و فرائض میں کسی قسم کی کمی یا بیشی آ جائے تو حقوق و فرائض کی ادائیگی کماحقہ' نہیں ہوئی۔ قرآن کریم میں جہاں بھی عدل سے متعلق کوئی چھوٹے سے چھوٹا ذکر بھی ہوا ہے تو عدل یا عادل یا اس کے مترادف لفظ "قسط" کہا گیا ہے۔ عدالت نام کی کوئی علیحدہ چیز یا ادارہ ہرگز پیش نہیں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہ تصور انگریزی قانون کا پیدا کردہ ہے۔ اس کی واضح مثال کچھ یوں دی جا سکتی ہے کہ ہمارے انگریزی قوانین کی روشنی میں اٹارنی جنرل حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ حکومت ایک ادارہ ہے۔ حکومت کی انفرادی حیثیت کوئی بھی نہیں۔ اب اگر کوئی عدالت (بطور ادارہ) حکومت کی سرزنش کرے یا حکومت سے کسی معاملے میں جواب طلبی کی جائے تو ظاہر ہے اٹارنی جنرل سے ہوتی ہے۔ (صوبوں کی صورت میں ایڈووکیٹ جنرل سے) اور وہ ہی اس کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔ انفرادی حیثیت سے اس کے ذہن پر انتہائی بوجھ ہوتا ہے اس بوجھ کو وہ بعض اوقات برداشت کرنے کے بھی قابل نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ مستعفی ہو جاتا ہے تو یہ ذمہ داری اسی کے تسلسل میں کسی آنے والے اٹارنی جنرل کے کاندھوں پر پڑ جاتی ہے۔ سابقہ اٹارنی جنرل خاموش تماشائی بن جاتا ہے یا زیادہ سے زیادہ اس کا استعفیٰ نامنظور کر کے اسے ہی ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس صورت میں حکومت خاموش تماشائی ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسری طرف سپریم کورٹ جس کا نمائندہ کوئی جسٹس' جج یا چیف جسٹس تھا' اور ہوتا ہے۔ اب موجودہ صورت میں سابقہ چیف جسٹس صاحب خاموش تماشائی سارے منظر کو دیکھ رہا ہے۔ اس لئے کہ اس کی توہین نہیں ہوئی بلکہ وہ جس ادارے کی نمائندگی کرتا تھا اس ادارے کی توہین ہوئی ہے۔ بھلے وہ کسی بھی قسم کا بیان دے یا مدعا علیہ کے لئے کہیں بڑھ کر توہین آمیز کلمات استعمال کرے' کوئی بات نہیں کیونکہ وہ یہ کہنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہے کہ یہ توہین میری نہیں بلکہ اس ادارے کی ہوئی ہے جس کا میں ایک نمائندہ تھا۔ لہٰذا ادارہ (سپریم کورٹ) اپنی توہین کا بدلہ چکائے۔ نتیجہ یہی نکلا کہ سابق چیف جسٹس بری الذمہ قرار دے دیا گیا۔ ادارے نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ حالانکہ سپریم کورٹ خاک و خشت و چوب پر مبنی کسی عمارت کا نام تو نہیں' اس میں گوشت پوست سے بنے ہوئے انسان جب بیٹھتے ہیں تو وہ سپریم کورٹ کہلاتی ہے۔ اب اگر ان بیٹھے ہوئے انسانوں کو ایک طرف کر دیا جائے تو باقی عمارت رہ جاتی ہے جس کی حیثیت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک واجب التکریم انسان (چپڑاسی یا چوکیدار) اسے کھولتا اور بند کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ سپریم کورٹ ایک ماورائی ادارہ ہے خالصتاً قرآنی تعلیمات یعنی اسلام کے خلاف ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یعنی اسلام نے کسی ادارے کو کسی بھی عمل یا فعل کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا۔ ہر شخص اگر وہ جج' جسٹس'

حاکم حتیٰ کہ چپڑاسی یا چوکیدار بھی کیوں نہ ہو اپنے اعمال کا ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ ہر ایک سے اس کے اعمال کی حد تک باز پرس ہو گی۔

جہاں تک آئین پاکستان کا تعلق ہے تو صرف اس کے سرورق پر لفظ "اسلامک" لکھ دینے سے یہ اسلامی نہیں ہو جاتا۔ جب تک اس کی تمام شقوں کو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ نہ کیا جائے۔ اسی کے تحت ہر شخص کو اس کے اعمال کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔ یا یوں سمجھئے کہ اگر پانی سے بھری بوتل پر عرق گلاب لکھ دیا جائے تو کیا وہ عرق گلاب ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح ہمارا آئین کسی صورت میں بھی اسلامی نہیں۔

جہاں تک توہین عدالت کا تعلق ہے تو قرآن کریم میں اور نہ ہی احادیث نبوی میں عدالت بطور ادارہ کے نظر نہیں آتی اس لئے اس کی توہین کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے لئے اسلامی اصطلاح قاضی یا قاضی القضاء یا محکمہ قضاء موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضیوں کو کبھی بھی ان کی غلطی یا غلطیوں کی نشاندھی کرنے والوں کو نہ تو کبھی سزا ہوئی ہے اور نہ ہی جرمانہ۔ چونکہ انگریز نے اپنی حکومت کو دوام بخشنے کے لئے اس قسم کے غیر اسلامی قوانین وضع کئے تھے اور جو آج بھی ہمیں ان سے وراثت میں ملے ہیں' جن میں سے ایک توہین عدالت بھی ہے۔ جو دراصل ایک ایسے ادارے کی توہین سے تعلق رکھتا ہے جس کا وجود بطور ادارہ اسلام میں کسی صورت میں بھی نہیں پایا جاتا۔

چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

عن عبدالملک بن میسرۃ قال: سمعت گردوس بن قیس و کان قاضی العامۃ بالکوفۃ یقول اخبرنی رجل من اصحاب بدر انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم یقول: لان اقعد فی مثل ھذا المجلس احب الی من اعتق اربع رقاب' قال شعبۃ: فقلت لای مجلس یعنی؟ قال کان قاضیا (السنن الکبریٰ للبیہقی ج 10 - ص 89)

ترجمہ: عبدالمالک بن میسرہ سے روایت ہے۔ بیان کرتے ہیں' میں نے کردوس بن قیس کو جو کوفہ میں عام لوگوں کے قاضی تھے' یہ کہتے سنا: مجھے ایک بدری صحابی نے بتایا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے سنا۔ میں اس نشست پر بیٹھوں۔ یہ مجھے زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اس کے کہ میں چار غلام آزاد کروں۔ شعبہ (جو اس کے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں میں نے (عبدالمالک بن میسرہ سے) پوچھا کہ کون سی نشست مراد ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ وہ قاضی تھے۔

منصب قضاء کی نزاکت یعنی انفرادی ذمہ داری:

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم قال: من ولی القضاء فقد ذبح بغیر سکین

(سنن ابی داؤد: ج 2 ص 147)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو منصب قضاء پر مقرر کیا گیا اس کو گویا بغیر چھری ذبح کر دیا گیا۔

دوسری روایت کچھ یوں ہے:

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ و سلم قال: من جعل قاضیا بین الناس فقد ذبح بغیر سکین (سنن ابی داؤد ج 2، ص 147)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ جو شخص لوگوں کے مابین قاضی بنا دیا گیا وہ گویا بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔

قاضی کا فریضہ انجام دینا اتنا ہی مشکل، تکلیف دہ اور جان گسل کام ہے جتنا بغیر چھری کے ذبح کیا جانا لہٰذا جو لوگ اس منصب کو قبول کریں ان کو اس راہ کی مشکلات کا پہلے سے خوب اندازہ کر لینا چاہئے۔ اور اس کے لئے تمام ضروری تیاریاں بھی کر لینی چاہئیں۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنھا قالت: سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: یدعی القاضی العدل یوم القیامۃ فیلقی من شدۃ الحساب ما یتمنی بہ انہ لم یقض بین اثنین فی ثمرۃ قط۔ (مسند امام احمد)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے یہ فرماتے ہوئے سنا۔ قیامت کے روز قاضی عادل کو بلایا جائے گا اور اس کو اس قدر سخت محاسبہ کا سامنا کرنا پڑے گا کہ وہ تمنّا کرے گا کہ کاش کبھی دو آدمیوں کے درمیان ایک کھجور کا بھی فیصلہ نہ کیا ہوتا۔

عن من بریرۃ عن ابیہ عن النبی صلی اللہ علیہ و سلم قال: القضاۃ ثلاثۃ واحد فی الجنۃ و اثنان فی النار فاما الذی فی الجنۃ فرجل عرف الحق فقضی بہ و رجل عرف الحق فجار فی الحکم فھو فی النار و رجل قضی للناس علی جھل فھو فی النار (سنن ابی داؤد، ج 2 ص 127)

ترجمہ: بریدہ اسلمی کے صاحبزادے اپنے والد سے نقل کرتے ہیں اور وہ رسول اللہ صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم جنّت میں اور دو قسم جہنّم میں۔ جو قاضی جنّت میں جائے گا وہ ہو گا جس کو حق کی پوری معرفت بھی حاصل تھی اور اس نے اس کے مطابق فیصلے بھی کئے۔ لیکن جس شخص نے حق کی معرفت ہونے کے باوجود فیصلے کرنے میں ظلم کیا وہ جہنم میں جائے گا۔ اسی طرح وہ شخص جس نے لوگوں کے مابین جہالت اور ناواقفی سے فیصلے کئے وہ بھی جہنم میں جائے

گا۔

اس قسم کی کئی احادیث ہیں لیکن طوالت کے پیش نظر اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس سے منصب عدالت کی نزاکت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر جس شخص کے اختیار میں لوگوں کے جان و مال اور عزّت و آبرو کا فیصلہ کرنا ہو اور اس نے زندگی بھر لوگوں کے جان و مال اور عزّت و آبرو کے فیصلے کئے ہوں تو اس کو کس قدر سخت حساب کتاب دینا پڑے گا۔ اس سے ایک ہی حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ عدالت کسی ادارے کی شکل میں کبھی بھی اسلامی نقطہ نظر سے نہ موجود رہی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی وجود سامنے آتا ہے۔ البتہ ہر مقام پر قاضی کے اعمال کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ منصب قضاء کے حصول اور اس کے لئے سفارش کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا ہے کہ:

عن عبدالرحمن بن سمرة: قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: یاعبدالرحمن بن سمرة لا تسال الا مارة' فانک ان او تتھاعن مسالتہ و کلت الیھاو ان او تیتھا عن غیر مسئلتہ اعنت علیھاو اذا خلفت علی یمین فو ابت غیر ھا خیر امنھا فکفر عن یمینک و ائت اللذی ھو خیر (بخاری کتاب الاحکام)

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: بیان کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا تھا۔ اے عبدالرحمٰن بن سمرۃ! تم اپنے لئے مناصب طلب مت کرنا' اس لئے کہ اگر تمہاری طلب اور کوشش سے تمہیں مناصب دیئے گئے تو تم ان کے حوالے کر دیئے جاؤ گے' لیکن اگر تم کو بغیر طلب اور کوشش کے یہ منصب اور عہدے دیئے گئے۔ تو ان کی انجام دہی میں تمہاری مدد کی جائے گی' اگر تم کسی بات کی قسم کھالو اور بعد میں محسوس کرو کہ کوئی راستہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے تو قسم کا کفارہ ادا کر دو اور جو راستہ بہتر ہے اس کو اختیار کر لو۔

عن ابی موسیٰ قال: دخلت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا و رجلان من قومی فقال احدالرجلین ا مر نایا رسول اللہ و قال الاخر مثلہ' فقال: انا لانولی ھذا من سالہ و لا من حرص علیہ

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے: بیان کرتے ہیں۔ میں اور میری قوم (قبیلہ) کے دو آدمی رسول اللہ صلعم کی: دوسرے نے بھی ایسی ہی درخواست کی آپؐ نے ارشاد فرمایا: ہم اس کام میں (یعنی عدالتی کام میں) کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو خود اپنے لئے اس کا طالب ہو یا اس منصب کا لالچ رکھتا ہو۔ (بخاری: کتاب الاحکام ص 1058)

عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا قالت: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم: من ابتلی بالقضاء بین ا لناس فلا رفعن صوتہ علی احدالخصمین مالا یرفع علی الاخر (سنن دار قطنی ج 2 - ص 511)

ترجمہ: ام المومنین حضرت ام سلمٰی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتی ہیں: رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا: جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی آزمائش میں ڈال دیا جائے اس کو چاہئے کہ کسی صورت میں بھی ایک فریق سے دوسرے فریق کے مقابلہ میں زیادہ بلند آواز سے ہرگز گفتگو نہ کرے۔ یعنی قاضی کو چاہئے کہ گفتار، کردار، لب و لہجہ ہر چیز میں دونوں فریقوں سے بالکل یکساں سلوک کرے۔

عن ام سلمہ قالت: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم: من ابتلی بالقضاء بین الناس فلیعدل بینھم فی لحظہ و اشارتہ و مقعدہ: (سنن دار قطنی ج 2، ص 511)

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی آزمائش میں ڈال دیا جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ ان کے درمیان اپنی نظروں، اشاروں اور انداز نشست میں بھی عدل سے کام لے۔

یہ عدل کا اعلیٰ ترین معیار ہے جس کا قاضی کو حکم دیا جا رہا ہے۔ فریقین کی طرف دیکھنے کا انداز، گفتگو میں اشارہ کرنے کا انداز اور بیٹھنے کے انداز میں بھی برابری اور مساوات سے کام لینا چاہئے، یہ نہ ہو کہ دوران مقدمہ قاضی صاحب ایک فریق کی طرف رخ کئے بیٹھے رہیں، یا ایک فریق کی بات سنیں تو بھرپور توجّہ کے ساتھ اور دوسرا بولے تو بس ایک نگاہ غلط انداز سے اس کی طرف دیکھ لیں۔

عن ام سلمہ قالت: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم: من ابتلی بالقضاء بین الناس فلا یرفعن صوتہ علی احد الخصمین مالا یرفع علی الاخر (السنن الکبریٰ بیہقی ج 2 - ص 135)

ترجمہ: ام المومنین حضرت ام سلمٰی رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے، بیان کرتی ہیں۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے کی سخت آزمائش میں ڈالا جائے تو اس کو چاہئے کہ فریقین میں سے ایک کے مقابلہ میں آواز بلند کر کے گفتگو نہ کرے جب تک کہ دوسرے کے مقابلہ میں بھی آواز کو اتنا ہی بلند نہ کرے۔

عن عبدالرحمن ابی بکرۃ قال: قال کتب ابو بکرۃ الی ابنہ: و کان بسجستان، ان لا تقض بین اثنین و انت غضبان، فانی سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: لا یقضین حکم بین اثنین و ھو غضبان (بخاری کتاب الاحکام ص 1060)

ترجمہ: عبدالرحمٰن ابن بکرہ سے روایت ہے: بیان کرتے ہیں: حضرت ابوبکرہ نے اپنے صاحبزادے کو جو سجستان میں (قاضی) تھے لکھا: تم دو آدمیوں کے درمیان غصّہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرنا اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے سنا ہے: کوئی حاکم دو آدمیوں کے درمیان غصہ کی حالت میں ہرگز ہرگز فیصلہ نہ

کرے۔

یہی حدیث دوسرے مقام پر بھی دہرائی گئی ہے۔ غصّہ کی حالت میں فیصلہ دینے کی ممانعت بار بار اور نہایت واضح الفاظ میں احادیث میں وارد ہوئی ہے۔ لہٰذا غصّہ کی حالت میں مقدمات کے فیصلے دینا ناجائز اور حرام ہے۔ اسی طرح اونچا بولنے کو بھی اچھا نہیں سمجھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ لقمان میں حضرت لقمان اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کرتے ہیں:

واقصد فی مشیک واغضض من صوتک ان انکر الاصوات لصوت الحمیر (31/19)

ترجمہ: اور اپنی رفتار (و گفتار) میں اعتدال اور میانہ روی کو ہمیشہ ملحوظ رکھو۔ اور چلّا چلّا کر نہ بولا کرو' نرم اور ہلکی آواز سے بات کیا کرو۔ چیخ کر گدھے بولتے ہیں اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ گدھے کی آواز کس قدر مکروہ ہوتی ہے اور سننے والوں پر کیسی گراں گزرتی ہے۔

آخری حدیث کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

عن ابی سعید ن الخدری رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یقضی القاضی الا وھو شبعان ریان (سنن دار قطنی ج 2' ص 512)

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: قاضی صرف اس وقت قضاء کے فرائض انجام دے' جب وہ خوب کھایا پیا اور سیر ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سخت بھوک اور پیاس کے عالم میں انسان کی توجہ ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اور ذہن صحیح طور پر کام نہیں کر رہا ہوتا۔ ایسے میں فیصلے صادر نہیں کرنے چاہیں۔ ورنہ کسی غلط فہمی' گھبراہٹ یا جھنجھلاہٹ کی وجہ سے غلط فیصلے سرزد ہو جانے کا امکان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شدید بھوک اور پیاس کی حالت میں نماز جیسے مقدس فریضہ کی ادائیگی سے بھی روکا گیا ہے۔ اسی حدیث کو سامنے رکھ کر انگریزی قانون میں عدالتوں کے لئے چائے کا وقفہ رکھا گیا ہے۔

محولہ احادیث نبوی کو سامنے رکھ کر اگر کوئی قاضی غصّہ کی حالت میں یہ کہہ دے کہ

"کئی لوگوں کو جہنّم تک بھیج دیا جائے گا" "کئی کے منہ کالے کر دیئے جائیں گے"

"کئی کو قبروں تک بھیج دیا جائے گا"

تو پھر اس قاضی کو مزید مقدمہ کی سماعت کا اختیار نہ ہونا چاہئے۔ اب اگر سپریم کورٹ کو غصہ آتا ہے۔ تو یہ انسان ہی تو ہیں جن کو غصّہ آتا ہے' ورنہ سپریم کورٹ فی ذاتہ تو کوئی چیز نہیں جسے غصہ آتا ہو۔ لہٰذا فریقین بھی انسان ہوں گے۔ اب انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جن کی توہین ہوئی ہے وہ مدعا علیہ کے ساتھ

کسی غیر جانبدار قاضی کے سامنے کھڑے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں توہین عدالت نام کا کوئی تصور نہیں۔ کیونکہ ہر معاملہ مابین فریقین یعنی دو انسانوں (جو زیادہ بھی ہو سکتے ہیں) کے درمیان ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ انسان خود کو بنیاد پرست مسلمان کہے یا محض اسلام کو کسی تڑکے کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دے دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کی بھی قرآن کریم اجازت نہیں دیتا۔ وہ اعتدال کے راستے کو زیادہ پسند کرتا ہے اور اعتدال اسی میں ہے کہ وہ نظام خداوندی میں پورے کا پورا داخل ہو جائے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

یایھاالذین امنو االدخلو افی السلم کافتہ و لا تتبعو اخطوت الشیطن اندلکم عدو مبین (2/208)

مفہوم: لہٰذا اے جماعت مومنین! تم یہی روش اختیار کرو' اور اس نظام خداوندی میں' جو امن اور سلامتی کا ضامن ہے' اجتماعی طور پر پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اور چند قدم چل کر رک نہ جاؤ بلکہ اس کی آخری حد تک پہنچو۔ اپنے ان (حیوانی سطح زندگی کے) جذبات کے پیچھے نہ لگ جاؤ' جنہیں اگر بے باک چھوڑ دیا جائے تو وہ انسان کو بلند اقدار کی سطح تک آنے نہیں دیتے' یہ روش انسان کی سخت دشمن ہے' اس سے بچنا۔ (2 / 208)

قرآن کریم قول اور فعل کی ہم آہنگی پر زور دیتا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ

یایھاالذین امنو لم تقولو ن مالا تفعلون (2 / 61)

اے دعوائے ایمان کرنے والو! اپنے دعوائے ایمانی کا ثبوت اپنے عمل سے پیش کرو' جو کچھ زبان سے کہو' اسے عمل سے پورا کر کے دکھاؤ' قول و فعل میں ہم آہنگی دعوائے ایمان کی صداقت کا ثبوت ہے" دو متضاد حقائق کبھی آپس میں ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم انفرادی اعمال پر زور دیتا ہے۔ یہی انفرادی اعمال اجتماعی شکل میں سامنے آتے ہیں' جس سے اسلامی معاشرہ متشکل ہوتا ہے۔ عام انسان تو ایک طرف خود حضور صلعم اپنے اعمال کے نتائج کے متعلق کس خوف کا اظہار فرماتے ہیں:

قل انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم 15 / 6' 15 / 10)

ان سے کہہ دو کہ خدا کا قانون مکافات ایسا ہے کہ (اس کے نتائج میں کسی کی ذرّہ برابر رعایت نہیں کی جاتی اور تو اور اگر میں بھی اس کے قوانین کی خلاف ورزی کروں تو مجھے ڈر ہے کہ ظہور نتائج کے وقت اس کے عذاب سے کبھی نہ بچ سکوں (اور جب میری اپنی یہ حالت ہے تو تم سوچو کہ میں کسی اور کو ان کے نتائج سے کیسے بچا سکتا ہوں' اس باب میں کسی کی کچھ نہیں چل سکتی)

حالانکہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ حضور صلعم سے کسی باز پرس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اب اگر خود ان کی یہ حالت ہے تو کوئی اور اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف وہ کسی تسلسل کے نتیجے میں قائم ہونے والے ادارے (رسالت کے نمائندہ بھی نہیں ہیں' تو پھر یہ کہنا کہ ادارے یعنی سپریم کورٹ کی توہین ہوئی ہے سراسر خلاف اسلام بات ہے۔

جہاں تک لفظ سپریم کورٹ کا تعلق ہے تو خود اسلامی نقطہ نظر سے بھی یہ ایک مشرکانہ اصطلاح ہے۔ جس کے ہم اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اب یہ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ البتہ اس کا خوف ہر لحہ اعصاب پر سوار رہتا ہے جو ذہنی پروان اور نشوونما کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ خود سپریم کا ترجمہ "سب سے بڑا' سب سے بلند اور برتر" ہے یہ الفاظ ہی تو ہیں جن سے کوئی نسبت مقرر کی جاتی ہے۔ اگر قاصد کو ہم پیغمبر کہنا شروع کر دیں تو فرق کچھ بھی نہیں پڑے گا۔ قاصد' قاصد ہی رہے گا اور پیغمبر' پیغمبر ہی رہے گا' لیکن ہو گا یہ غلط۔ اسی طرح اگر سب سے اعلیٰ اور سب سے برتر ذات خدا کی ہے یا بالفاظ دیگر وہ (اللہ تعالیٰ) سپریم ہے' تو پھر یہی الفاظ انسانوں کی وضع کردہ عدالت کے لئے استعمال کرنا خود شرک فی الصفات کے زمرہ میں آتے ہیں۔ شرک کی کوئی ایک قسم نہیں۔ چنانچہ سورہ لقمان کی آیت نمبر 13 ملاحظہ ہو:

و اذ قال لقمن لابنہ و ھو یعظہ یبنی لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم (31 / 13)

مفہوم: لقمن خود بھی احکام خداوندی کا اتباع کرتا ہے اور اپنی اولاد کو بھی ان کے اتباع کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے سے' جسے وہ حکم کے اصول سمجھاتا تھا۔ کہا اے میرے بیٹے! (سب سے پہلے اس بنیادی اصول کو سمجھ لو جس پر انسانی فکر کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ) اللہ کے اقتدار و اختیار میں کسی اور کو شریک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اللہ کو اس کے مقام بلند سے نیچے اتارتا ہے اور غیر خدائی قوتوں کو ان کے مقام سے اونچا لے جاتا ہے' یہ بہت بڑی بے انصافی ہے (انسان جن قوتوں کو خدا کا درجہ دے دیتا ہے۔

وہ یا تو فطرت کے مظاہر ہیں اور یا خود دوسرے انسان' مظاہر فطرت سب انسان کے لئے مسخر کئے گئے ہیں' اور انسان' انسان ہونے کی جہت سے' سب برابر ہیں' اس لئے کسی انسان کا' کسی دوسرے انسان' یا مظاہر فطرت میں سے کسی کے سامنے جھکنا' اس کے شرف انسانیت کی تذلیل ہے' تم بٹیا! ایسا کبھی نہ کرنا۔"

یہ تو ایک انسان کا کسی دوسرے انسان کو اپنی طرف جھکانے یا حکم منوانے کی بات ہے۔ اس سلسلے میں تو خدائے لم یزل نے خود نبی کو بھی اپنا حکم منوانے سے روکا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ما کان لبشر ان یو تیہ اللہ الکتب و الحکم و النبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون ا

للہ ولکن کونوا ربنین بما کنتم تعلمون الکتب و بما کنتم تدرسون (3/78)

مفہوم: کسی انسان کو کو اس کا حق حاصل نہیں ——— خواہ اسے ضابطہ قوانین یا اقتدار حکومت اور نبوّت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ لوگوں سے کہنا شروع کردے کہ تم خدا کی نہیں میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم سب اس کتاب کی اطاعت کرو جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و فکر سے تم اس کے معانی کی تہ تک پہنچتے ہو۔ ربانی بن جاؤ۔ یعنی خدا کے محکوم۔

ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ (12/40)

یاد رکھو! اختیارات و اقتدارات کا واحد مالک خدا ہے' اس کے سوا حکومت کا حق کسی کو حاصل نہیں' اس کا فرمان یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اور اطاعت اختیار نہ کی جائے۔

ذلک الدّین القیم و لکن اکثر الناس لا یعلمون (12/40)

یہ ہے زندگی کا محکم اور استوار نقشہ' لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

و لا یشرک فی حکمہ احدا (18/26)

اور یہ بھی کہ وہ اپنے اس حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

صرف شرک اور اس کے اقسام کے لئے ملاحظہ ہو۔ 24-23/6'22/34'40/35'4/64'14/35'150/3'82-81/6'28/30'89/6'31/22'31/30'31/30'13/42'72/5'48/4'116/4'26/50'48/4'54/2'92/2'24/6'166/2'122 6'173/2'3/5'146/6'115/16'119/4'3/5'103/5'45-139/6'33/7'71/22'35/30'109/11 دوسری طرف اس سے بھی بڑا مشرکانہ خطاب جو عام طور پر عدالتوں میں استعمال ہوتا ہے اور جسے کبھی بھی کسی جج نے نہیں ٹوکا۔ "مائی لارڈ" ہے لارڈ کا ترجمہ۔ "مالک' حاکم' خداوند' خدا' رب' اور یسوع مسیح" ہے' دراصل یہ خطابات یا اصطلاحات مذہبی تھیں۔ جب کراؤن اور چرچ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوئے' کراؤن جیت گیا' چرچ ہار گیا' تو کراؤن نے چرچ کو نیچا دکھانے کے لئے ان مذہبی اصطلاحات کو اپنے ہاں رائج کیا۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ دورِ ملوکیت میں ہوا۔ عیسائیت نے سولہویں اور سترھویں صدی میں چرچ کو مکمل طور پر کراؤن کے معاملات سے باہر نکال پھینکا۔ ہمارے ساتھ دوسری صدی ہجری کے آغاز ہی میں ایسا ہوا۔ جس کے نتیجے میں دنیاوی معاملات کراؤن کے حصے میں آئے اور جھاڑ' پھونک یا اخروی زندگی چرچ کو ملے۔ ہم اس دور یا نظام حیات کی باقیات ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارا آئین مغربی انداز فکر کا ایک شاہکار ہے اور دوسری طرف شریعت کو قومی اسمبلی سے نافذ کروانے کے لئے

"سنی فقہوں" یا "شیعہ فقہوں" پر مشتمل بل پیش کئے جاتے ہیں۔ آئین اگر سیکولر ہو تو خدا کی حاکمیت کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ صرف سرورق پر لکھنے سے کبھی اسلامی نہیں ہو سکتا۔ غرض مذکورہ تمام اصطلاحات اسلامی تعلیمات کے یکسر خلاف ہیں۔ اور نہ ہی اس قسم کے انداز تخاطب کی اسلام اجازت دیتا ہے۔

چونکہ اسلام میں خود قاضی' قاضی القضاء اور محکمہ قضا کی اصطلاحات موجود ہیں۔ جو اپنے اندر ایک گہرائی رکھتے ہیں۔ یہی لفظ قضا کی مختصر تشریح ضروری ہو گی۔ جو سراسر انفرادی عمل کے نتیجے میں سامنے آتی ہے' جس کے لئے قاضی ذمہ دار ہے' القضاء کے مختلف معنی آتے ہیں' لیکن ان تمام معانی کی اصل کسی چیز کا منقطع ہونا' ختم ہونا اور مکمل ہو جانا ہے' ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو محکم اور مضبوط کرنا اور اسے اس کی جہت پر نافذ کرنا ہے۔ یعنی جس طرف اسے جانا چاہئے ادھر لے جانا۔ راغب نے القضاء کے معنی جدا کرنا اور قطع کرنا لکھے ہیں' **قد قضی دینہ** کے معنی ہیں اس نے اپنے قرض کو پورا پورا چکا دیا۔ اور اس طرح قرض خواہ کا جو معاملہ اس کے ساتھ تھا اسے ختم کر دیا۔ اسی لئے اس کے معنی حتمی اور آخری فیصلہ کے آتے ہیں۔ چنانچہ القضی موت کو کہتے ہیں' قضی الیہ کے معنی ہیں' معاملہ کو اس حد تک پہنچا دیا قرآن کریم میں خدا کے متعلق ہے **اذا قضی امرا** (12 / 117) جب وہ کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے' سورہ طہ میں ہے کہ دربار فرعون کے ساحرین نے فرعون سے کہا کہ **فاقض ما انت قاض** (20 / 72) جو کچھ تو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر دے' سورہ قصص میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے قبطی کو مکا مارا۔ **فقضی علیہ** (28 / 15) اس کا کام تمام کر دیا۔ اس سے ذرا آگے ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنے سسر سے کہا کہ **ایما الاجلین قضیت** (28 / 28)۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو مدت بھی میں پوری کر دوں۔ سورہ مومن میں ہے۔ **واللہ یقضی بالحق** (40 / 20) اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔ سورہ مریم میں ہے۔ **امرا مقضیا** (19 / 21) فیصلہ شدہ بات' طے شدہ معاملہ' مقررہ قانون۔ اس کے علاوہ بھی کئی مقامات ہیں۔ صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ کہیں بھی کسی ادارے کا ذکر نہیں' جہاں بھی یہ اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ انفرادی عمل کے نتیجے میں استعمال ہوئی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں سو سے زائد مقامات پر عدل کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اس کا مرادف "قسط" بھی استعمال ہوا ہے۔

توہین سے متعلق ایک مشہور واقعہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے' کا ذکر بے جا نہ ہو گا۔

ایک مرتبہ رات کو حسب معمول گشت فرما رہے تھے' ایک مکان سے کچھ ایسی آواز آئی جس سے

ان کو خیال ہوا کہ شاید چند لوگ شغل مے نوشی میں مصروف ہیں۔ آپؓ نے دیوار پر چڑھ کر جھانکا اور ڈانٹ کر پوچھا کہ کیا کر رہے ہو؟ اندر سے جواب ملا۔ ہم تو جو بھی کچھ کر رہے ہیں۔ آپ نے یہ حکم خداوندی کی خلاف ورزی کیوں کہ کہ بلا وجہ بدگمانی کی اور ٹوہ لگایا امیر المومنین نے اس دلیل کو قبول فرمایا اور ان لوگوں سے کوئی تعرض نہ کیا"

دوسرا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ مال غنیمت کی تقسیم کے بعد ایک شخص نے مسجد میں حضرت عمرؓ سے پوچھا۔ اے عمرؓ تم مجھ سے قد کاٹھ میں زیادہ ہو تم نے مجھے جو کپڑا مال غنیمت میں سے دیا اس سے میری قمیص تو نہ بن سکی اور تمہارا جوڑا بن گیا۔ حضرت عمرؓ نے بیٹے کی طرف اشارہ کیا۔ بیٹے نے جواب دیا کہ میں نے اپنا حصہ کپڑے کا بابا کو دیا ہے۔ تب اس کی تسلی ہوئی۔ حضرت عمرؓ بیک وقت حاکم' منصف' سپہ سالار' فقیہ' خلیفہ اور بہت کچھ تھے۔ انہوں نے اسے اپنی توہین نہ سمجھا۔ اس کے برعکس ہم کسی جج سے نجی زندگی تو ایک طرف کسی سرکاری فرائض کی ادائیگی کے متعلق بھی نہیں پوچھ سکتے۔ اس کی وجہ ملوکیت کا اسلام ہے' خلافت راشدہ کا نہیں۔

حضور صلعم کی گردن مبارک میں ایک یہودی نے چادر ڈال دی تھی اور اتنا ضرور لگایا کہ آپؐ کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ وہ یہودی اپنا قرض مانگ رہا تھا۔ آپؐ نے اسے درگذر کر دیا ورنہ اس سے بڑی توہین اور پھر ایک ایسی ہستی کی جو وجہ تخلیق کائنات ہے' آپؐ نے کوئی برا نہیں منایا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آج ہم نے شاتم رسول کے لئے سزائے موت مقرر کر دی ہے' جو درست ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرنے والے کے لئے بھی کوئی سخت قانون ہونا چاہئے' دوسری طرف کسی انسانی عدالت میں بیٹھے ہوئے جج یا انسانی وضع کردہ عدالت کو توہین کے لئے سزا مقرر ہے۔ بس یہی فرق ہے اسلامی عدالت اور انگریزی عدالت میں:

اب آیئے! ذرا عدالت عظمیٰ کے ایک اور گوشے کو بھی جھانک لیں۔

عدالت عظمیٰ یا عدالت عالیہ کا جج یا جسٹس جب حلف اٹھاتا ہے تو نہ خدا کی قسم اٹھاتا ہے اور نہ ہی اپنے اوپر کسی لعنت پڑنے یا قہر کا اظہار کرتا ہے۔ بلکہ آئین پاکستان جو سراسر غیر اسلامی ہے کے تحفظ کی قسم کھاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسی کی عدالت میں پیش ہونے والا گواہ اللہ کی قسم اٹھانے کے بعد جھوٹ کہنے پر خود کو قہر الٰہی کا پابند کرتا ہے۔ جو کسی صورت میں بھی حلف نہیں بلکہ بددعا ہے۔ اس کے برعکس ہائیکورٹ کا ایک جج برملا بعض حالات میں سچ سے گریز کا اعلان کرتا ہے۔ جبکہ قرآن کریم کی تمام تعلیمات کا نچوڑ سچ کے سوا کچھ بھی نہیں:

یہاں حضرت عمرؓ کی طرف سے ابو موسیٰ اشعری کے نام اس تاریخی خط کا حوالہ دیئے بغیر بات ادھوری رہے گی جس میں انہوں نے محکمہ قضاء کے متعلق انہیں ہدایات جاری فرمائی تھیں:

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے"

"اللہ کے بندے عمر بن الخطاب امیر المومنین کی طرف سے عبداللہ بن قیس (ابو موسیٰ اشعری) کے نام"

السلام علیکم۔ امابعد:

نظام قضاء کا قیام ایک محکم فریضہ اور ایک ایسی سنت ہے جس کا ہمیشہ اتباع کیا گیا ہے۔ لہٰذا جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہو تو تم اس کو اچھی طرح سمجھ لو' اس لئے کہ جو حق نافذ نہ کیا جا سکے اس کے بارے میں باتیں بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اپنی نشست و برخاست اور چہرے کے تاثرات تک میں لوگوں کے درمیان برابری اور مساوات قائم رکھو۔ تاکہ کوئی بااثر آدمی یہ غلط امید نہ رکھے کہ تم سے کسی کے خلاف کوئی زیادتی کرا لے گا اور کوئی کمزور شخص اس سے مایوس نہ ہو کہ اس کو تمہارے ہاں سے عدل و انصاف نہ ملے گا۔ اور اسی طرح کوئی کمزور شخص تمہاری سختی سے خوفزدہ نہ ہو۔ بار ثبوت مدعی کے ذمہ ہے اور قسم اس شخص کی ذمہ داری ہے جو دعویٰ کی صحت کا انکار کر رہا ہو۔ لوگوں (بعض روایات کے الفاظ میں مسلمانوں) کے درمیان ہر قسم کی صلح' مصالحت اور راضی نامہ جائز ہے' سوائے اس صلح یا راضی نامہ کے جو کسی حرام کو حلال قرار دے دے یا کسی حلال کو حرام قرار دے دے

اگر تم نے کل کوئی فیصلہ کیا ہے اور آج تم نے اس پر دوبارہ غور و فکر کیا ہے اور تم کو راہ راست کی طرف راہنمائی حاصل ہو گئی ہے تو محض یہ بات کہ تم کل ایک فیصلہ کر چکے ہو تمہیں ہرگز ہرگز حق کی طرف رجوع کرنے سے باز نہ رکھے۔ اس لئے کہ یاد رکھو حق ایک اٹل حقیقت ہے' اس کو کوئی دوسری چیز باطل یا غلط نہیں ٹھہرا سکتی' اور یاد رکھو! کہ باطل پر اڑے رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ حق کی طرف رجوع کر لیا جائے۔

جن معاملات میں قرآن و سنت کی کوئی ہدایت موجود نہ ہو اور وہ تمہارے دل میں کھٹکتے ہوں۔ ان کے بارے میں خوب غور و فکر اور سمجھ بوجھ سے کام لو۔ ایسے نئے نئے مسائل حل کرنے کے لئے تم پہلے قرآن و سنت میں موجود ملتے جلتے مسائل اور اصولوں سے واقفیت حاصل کرو اور پھر نئے معاملات کو ان اصولوں پر قیاس کر لو۔ اس کے بعد جو حل تمہارے رائے میں اللہ کو زیادہ محبوب' اس کی مرضی کے زیادہ قریب اور حق سے زیادہ مشابہ معلوم ہو اس کو اختیار کر لو۔ جو شخص تمہارے سامنے یہ دعویٰ کرے کہ

اس کے پاس اپنے موقف کی تائید میں کوئی حق بات موجود ہے جو اس وقت وہ پیش کرنے سے قاصر ہے تو اس کو اتنی مہلت دو کہ وہ اس بات کو پیش کر سکے' اس مہلت کے اندر اندر اگر وہ کوئی ثبوت لے آیا تو وہ اس کی بنیاد پر اپنا حق لے لے گا۔ ورنہ بصورت دیگر تمہارے لئے جائز ہو گا کہ تم اس کے خلاف فیصلہ دے دو' اس لئے کہ ایسا کرنے سے اس کو کوئی عذر پیش کرنے کا موقعہ نہ ملے گا۔ اور اس کی بے بصیرتی اس پر واضح ہو جائے گی:

مسلمان سب کے سب عادل ہیں۔ اور ایک کی گواہی دوسرے کے خلاف قابل قبول ہے۔ سوائے اس شخص کے جس کو کوئی سزائے موت دی گئی ہو یا اس کے بارے میں یہ تجربہ ہو چکا ہو کہ وہ جھوٹی گواہی دیتا ہے' یا اس (کی جانبداری) کے بارے میں اس وجہ سے کوئی بدگمانی کی جا رہی ہو کہ وہ صاحب معاملہ کا (جس کے حق میں گواہی دے رہا ہے) کوئی رشتہ دار یا تعلق دار ہے' جہاں تک (گواہی کے معاملہ میں) لوگوں کی پوشیدہ اور چھپی ہوئی باتوں کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ذمہ داری خود اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ اب تمہاری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ پیش کردہ ثبوت کی بنیاد پر فیصلہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حدود سے بچالیا ہے۔ کہ سوائے واضح اور مضبوط ثبوت یا قسم کے حد جاری نہیں ہو سکتی۔

غصہ سے پرہیز کرو۔ تنگدلی اور پریشانی سے بچو۔ لوگوں کی مقدمہ بازی سے اکتاہٹ اور تکلیف محسوس نہ کرو۔ اس لئے کہ یہی وہ مواقع ہیں جہاں تمہیں حق نافذ کرنا ہے۔ یہ کام تمہارے لئے اللہ کے ہاں اجر کا موجب اور آخرت میں بہترین ذخیرہ کا سبب بنے گا جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان حق کے معاملہ میں نیت کو صاف اور خالص کر لیتا ہے۔ چاہے اس کا نتیجہ اس کے اپنے ہی خلاف پڑ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے درمیان کے معاملات کو بھی صاف اور خالص کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص دنیا کے سامنے خود کو اس طرح مزین کر کے پیش کرے گا کہ اصل حقیقت جس کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے' اس سے مختلف ہو تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ رسوا کرے گا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف وہی عبادت قبول کرتا ہے جو خالص اسی کے لئے ہو' تو بتاؤ! تمہارا کیا خیال ہے۔ اس اجر و ثواب کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ نے دنیاوی رزق اور اخروی خزائن رحمت کی شکل میں بندوں کے لئے محفوظ کر رکھا ہے؟ والسلام علیکم

یہ خط کاشانہ نبوت کے تربیت یافتہ ایک صحابی کا دوسرے صحابی کے نام ہے۔ جس میں اصول قضا کی ایسی تصویر کھینچ دی گئی ہے جو رہتی دنیا تک اپنا اثر اور مقام قائم و دائم رکھے گی۔

اس قسم کے کئی خطوط حضرت عمرؓ کی طرف سے اس وقت کے قاضیوں کے نام ہمیں ملتے ہیں۔ قاضی

شریح کے نام حضرت عمرؓ کا یہ خط پورے محکمہ قضاء کی بنیاد ہے:

لا تشار و لا تمار و لا تبع و لا تبع فی مجلس القضاء و لا تقض بین اثنین و انت غضبان (البیان والبیین - جلد دوم ص 75)

کمرہ عدالت کے اندر:

1- نہ تو کسی سے جھگڑا کرو۔

2- نہ بلا وجہ بحث و مباحثہ کرو۔

3- نہ فروخت کرو۔

4- نہ کوئی چیز خریدو

اور غصّہ کی حالت میں کبھی بھی دو آدمیوں کے درمیان کوئی فیصلہ نہ کرو۔

قاضی شریح 75 سال کوفہ کے قاضی رہے اور تقریباً سو سال کی عمر میں وفات پائی۔

محکمہ قضاء کی اہمیت اور نزاکت کا اندازہ اس سے باآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ جب 132 ہجری میں بغداد میں سلطنت عباسیہ قائم ہوئی تو خلیفہ منصور نے بغداد کو دارالخلافہ بنایا۔ 124 ہجری میں امام ابو حنیفہؒ کو خلیفہ نے بلایا اور قاضی کا عہدہ پیش کیا۔ آپؒ نے انکار کر دیا اور فرمایا "مجھ میں اس کی قابلیت نہیں ہے" منصور نے کہا۔ "آپ جھوٹ بول رہے ہیں" آپؒ نے جواب دیا "اگر میں جھوٹا ہوں تو آپ ایک جھوٹے کو قاضی مقرر نہیں کر سکتے" خلیفہ لاجواب ہو گئے پھر آپؒ نے انہیں سمجھایا کہ میں عربی النسل نہیں ہوں' اس لئے اہل عرب کو میری حکومت ناگوار گزرے گی۔ لیکن منصور نے قسم کھا کر کہا کہ آپ کو عہدہ قبول کرنا ہو گا۔ آپؒ نے بھی قسم کھا کر کہا کہ ہرگز قبول نہ کروں گا۔ خلیفہ نے آپؒ کو قید کر دینے کا حکم دے دیا۔ ایک روایت کے مطابق آپؒ کا قید میں ہی انتقال ہو گیا۔ اس کے برعکس آج اس منصب کے حصول کے لئے جو کچھ ہوتا ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔

ارشاد خداوندی ہے:

انا انزلنا الیک الکتب بالحق لتحکم بین الناس بما ارک اللہ و لا تکن للخائنین خصیما و استغفر اللہ ان اللہ کان غفورا رحیما و لا تجادل عن الذین یختانون انفسھم ان اللہ لا یحب من کان خوانا اثیما یستخفون من الناس و لا یستخفون من اللہ و ھو معھم اذ یبتون ما لا یرضی من القول و کان اللہ بما یعملون محیطا ھانتم ھولاء جدلتم عنھم فی الحیوۃ الدنیا فمن یجادل اللہ عنھم یوم القیمۃ ام من یکون علیھم وکیلا (109-105/4)

مفہوم: تمہاری طرف یہ کتاب (ضابطہ قوانین) نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے نزاعی امور کے فیصلے اس علم کے مطابق کرو جو اللہ نے تمہیں اس طرح عطا کیا ہے۔ اور ایسا کبھی نہ کرو کہ دغا باز اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے وکیل بن کر جھگڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔

حکومت اور عدالت کا معاملہ بڑا نازک ہے' اس میں انسان کے ذاتی میلانات' فیصلوں پر اثر انداز ہو جایا کرتے ہیں۔ اس سے انسان اسی صورت میں بچ سکتا ہے کہ وہ' ہر وقت' قانون خداوندی کو اپنے سامنے رکھے' اور اسی کے پیچھے پناہ لے۔ تم اسی طرح' اپنی حفاظت کا سامان طلب کرتے رہو' قانون خداوندی میں ایسی حفاظت اور مرحمت کا پورا پورا انتظام ہے۔

اس بات کو پھر سمجھ لو کہ جو لوگ ایک دوسرے سے' یا خود اپنی ذات سے خیانت کرتے ہیں۔ ان کی طرف وکیل بن کر جھگڑنے کے لئے نہ اٹھ کھڑے ہو۔ خیانت کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس سے اسے کچھ مل گیا ہے' حالانکہ' اس سے' اس کی ذات میں ایسی کمزوری آجاتی ہے جس سے اس کی انسانی صلاحیتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں (اسی کو خود اپنی ذات سے خیانت کہتے ہیں) سو ایسے لوگ قانون خداوندی کی نگاہ میں کیسے پسندیدہ قرار پا سکتے ہیں؟

یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم' اپنے جرائم' لوگوں سے چھپا سکتے ہیں' اس لئے ہم پر کیا گرفت ہو گی؟ لیکن یہ خدا کے قانون کی نگاہوں سے کیسے چھپ سکتے ہیں؟ وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے' جب یہ راتوں کو چھپ چھپ کر' ناپسندیدہ امور کے متعلق مشورے کرتے ہیں' خدا کا قانون مکافات ان کے تمام اعمال کو محیط ہے۔ (19 / 40)

(یاد رکھو! خدا کا مکافات ایسا نہیں کہ اس کا سلسلہ صرف اسی دنیا تک محدود ہو۔ کہ اگر کسی نے ایسا انتظام کر لیا کہ وہ یہاں قانون کی گرفت سے بچ جائے تو وہ مواخذہ سے چھوٹ گیا۔ بالکل نہیں' ہر جرم کا اثر مجرم کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ (14 / 17) اور انسانی ذات اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کا سلسلہ آگے بھی چلتا ہے۔ اس لئے انسان کے اعمال کے نتائج مرنے کے بعد بھی سامنے آجاتے ہیں۔ بنا بریں اگر تم کسی مجرم کے طرفدار بن کر' اس کی طرف سے' اس دنیاوی زندگی میں جھگڑتے ہو (اور اس طرح اسے غلط بیانیوں سے' قانون کی گرفت سے بچا بھی لیتے ہو) تو یہ بتاؤ کہ اس کے اعمال کے ظہور نتائج کے وقت' اس کی طرف سے کون جھگڑ سکے گا' اور کون اس کی وکالت کے لئے کھڑا ہو سکے گا۔؟

المختصر!: یہ کہ تعلیمات قرآنی کا نقطہ ماسکہ یہی ہے کہ وہ انسانی ذات کو اپنے اعمال صالحہ کے حوالے سے مقام بلند پر پہنچا دے یہیں سے **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم** کا آغاز ہوتا ہے ورنہ **ثم رددنہ**

سفل سفلین (5-4 / 95) کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس لئے اللہ کے نزدیک انسانی اعمال کسی ادارے کے ساتھ نہ تو وابستہ ہیں اور نہ ہی وابستہ کئے جا سکتے ہیں۔

آخر میں ایک گذارش ضروری سمجھتا ہوں کہ جیسے ہماری بڑی عدالتوں کی یہ ایک روایت رہی ہے کہ ہر جج یا جسٹس ریٹائر ہونے سے پہلے کوئی نہ کوئی تاریخی فیصلہ کر جاتا ہے۔ لہٰذا آپ سے بھی عمومی طور پر کچھ اسی قسم کی توقعات کی جا رہی ہیں اگر آپ مناسب سمجھیں تو عدالتی نظام کو قرآنی نظام میں تبدیل کرنے کی سفارشات کرتے جائیں۔ موجودہ مشرکانہ نظام کو ختم کر کے خالص اسلامی عدل کے قیام کی سفارش سرفہرست ہونی چاہئے۔ جج صاحبان کا حلف، گواہ کا حلف، کسی جج کی غلطی کی نشاندھی کے لئے کسی اعلیٰ مستقل کونسل کا قیام، قرآن کریم سے بلا واسطہ ہدایات لینے کی سختی سے پابندی کا حکم، عدلیہ کی انتظامیہ پر برتری، عدلیہ کی انتظامیہ سے فوری علیحدگی، انگریز کا قائم کردہ فرسودہ توہین عدالت کے قانون کا خاتمہ، ریٹائرمنٹ کے بعد حصول رزق کے لئے کسی بھی عدالت میں جج کا پیش ہو سکنا بطور وکیل، جو عام طور پر اپنی برتری کی بنا پر ماتحت عدالتوں میں پیش نہیں ہو سکتے، جس سے ایک کی برتری اور دوسرے کی کمتری عیاں ہے اس کا خاتمہ، وغیرہ وغیرہ ——

اس قدر خالق نے آدم بھی نہیں پیدا کئے
جس قدر مخلوق نے تخلیق کر ڈالے خدا

(حسنین بخاری)

☆... تحریر: ملک حنیف وجدانی

اکیسویں صدی کے تقاضے اور قرآن

(نظریہ، قانون سازی اور قوت نافذہ)

(قسط نمبر1، 2- میں "مسلم قومیت" متبادل معاشی نظام یعنی نظام ربوبیت اور "قرآنک ورلڈ آرڈر" کا ذکر خیر آچکا ہے۔ (قسط نمبر3)

4- مستقل اقدار حیات۔ (علم وحی کا حرف سردار)

فکر انسانی، معاشرہ کے لئے جو اصول وضع کرتی ہے۔ تجربات کے بعد یہ انتقام و مایوسی سے متاثر جذبات کی رو میں بہہ کر، ان کو بدل دیا کرتی ہے۔ ان حالات میں مفکرین اور مدبرین یہی تقاضا کرتے ہیں کہ کچھ اصول تو ایسے ہونے چاہیں جن کو تبدیل نہ کیا جا سکے" ظاہر ہے کہ یہ اصول یا اقدار فکر انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ اقوام سے آگے بڑھ کر "انسانی ہیئت اجتماعیہ" کے لئے ایسے اصول یا اقدار صرف علم وحی کے ذریعہ ہی مل سکتی ہیں۔ "اللہ جل جلالہ" جو ارض و سموت، نباتات، حیوانات اور نوع انسانی کا خالق و مالک و رازق ہے۔ وہی انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے اقدار حیات دے سکتا ہے۔ اور انسانوں کے لئے عطا کردہ علم وحی کا جو آخری شاہکار "قرآن کریم" جناب رسالتمآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اس میں "مستقل اقدار حیات" کی تفصیل موجود ہے (میں تبویب القرآن کے استفادہ سے یہ اقدار درج کر رہا ہوں)

1- اس نظام "وحدت آدم" یعنی "انسانی ہیئت اجتماعیہ" کا مرکز کعبہ ہی واحد مرکز ہو گا 148-144 / 2، 97 / 5

2- قرآن، کتاب منیر 8 / 22، کتاب مبین 2 / 12 کتاب الحکیم 1 / 10 کتاب عزیز 41 / 41 اور ذکر للعالمین 91 / 6 ہے۔ اس جیسی کتاب بنا دینا ناممکن ہے 23 / 2 یہ الفرقان 185 / 2 اور ھدی للناس 3 / 3 ہے۔ قرآن میں مومنین کے لئے شفا و رحمت ہے۔ 82 / 17 اگر یہ منجانب اللہ نہ ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے 82 / 4 اور **و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون** اور جو اپنے فیصلے **ما انزل اللہ** (قرآن) کے مطابق نہیں کرتے تو یہی لوگ کافر ہیں اس سے اگلی آیت (45 / 5) میں ان کو ظالم اور (48 / 5) میں ان کو فاسق کہا گیا ہے۔ اور آج یہی منکرانہ، ظالمانہ اور فاسقانہ کردار ہمارے معاشرے میں چھپائے چھپ نہیں سکتا۔

3- احترام انسانی ذات و خودی و انا ایک مستقل قدر ہے۔ آیئے پہلے اس پر غور کریں کہ انسان کیا ہے؟ انسان نام ہے!

(i) بدن، جسم، تن، فزیکل باڈی اور حیوانی لوازمات کی انتہائی متوازن و معتدل ترقی یافتہ شکل اور

(ii) روح، انا، من خودی، انسان ذات، نفس۔

(Personality) کے یکجا ہونے کا۔

اسی سے انسان میں انسانیت۔ آدم (آدمی) میں آدمیت، شخص میں شخصیت، بدن میں روحانیت اور تن میں من کی دنیا ہے۔ اسی جوہر سے انسان احسن التقویم قرار پایا۔ اور اسی قوت اختیار و ارادہ سے وہ اکثر مخلوق سے اشرف و افضل ہے۔ اسی خاص الخاص امتیاز **و لقد کرمنا بنی ادم** (70 / 17) سے انسان واجب التکریم بنا، رنگ، زبان، نسل، وطن اور جنس کے امتیاز کے بغیر ہر انسانی بچہ واجب التکریم ہے۔ اور نفخ روح کا یہ عطیہ خداوندی انسان کے لئے یوں اعزاز بنا۔ **و نفخت فیہ من روحی** (71 / 38، 91 / 21)

علامہ اقبال فرماتے ہیں ۔

خویشتن را وانمودن زندگی است

ضرب خود را آزمودن زندگی است

خودی تعمیر کن در پیکر خویش

چو ابراہیم معمار حرم شو

اور خودی نسب کے جال میں گرفتار نہیں رہ سکتی اس کے متعلق اصول یہ ہے۔

مسلمان زادہ، ترکِ نسب کن

اصل عشق از آب و بادہ و خاک نیست

گویا اس کائنات میں خودی والے دو ہیں اللہ اور انسان (29 / 50، 14 / 20، 93 / 21) انسانی دنیا میں روح کی تربیت (روحانیت) اور تزکیہ نفس بھی اللہ کے احسان سے ہوا۔ ہمیں حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سے بہتر جلال اور جمال کی خودی والا کوئی اور نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے آپ کو اوّل المسلمین کہتے ہیں۔ آج انسانی خودی کا استحکام اور تزکیہ نفس علم وحی کے بغیر ممکن نہیں حضرات انبیائے کرامؑ کے سلسلہ زریں و جوئے نور کی آخری کڑی جناب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خودی و خودداری کے کوہ نما استقامت کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ آیئے "**انائیے محمدؐ**" کا کچھ ذکر خیر قرآن کریم کے نقطہ نظر سے ہو جائے۔ "**انائیے محمدؐ**" کو قرآن کریم میں "ک" اور "انت" کے الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے۔ یہی احترام و اعزاز محمدؐ کی وہ بنیاد ہے۔ جو ہمیں قرآن کریم سے

مل سکتی ہے۔ انما انت نذیر (11/12) تحقیق تو ڈرانے والا ہے۔ کس سے؟
بما انزل الیک (4/1) جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا
قال ربک (2/30) تیرے رب نے ملائکہ سے کہا
فسیکفیکھم اللہ (2/137) تیری کفایت کے لئے اللہ کافی ہے۔
و انہ للحق من ربک (2/149) اور تحقیق تیرے رب کی طرف سے یہ حق ہے۔
و اذا سالک عبادی (2/186) اور جب میرے بندے تجھ سے سوال کریں۔
یسئلونک (2/219) جب تجھ سے سوال کریں۔
نزل علیک الکتب (3/3) تجھ پر کتاب نازل کی۔
فانما علیک البلغ (3/20) تحقیق تجھ پر پیغام پہنچا دینا ہے۔
نتلوھا علیک بالحق (3/108) ہم تجھ پر حق کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں۔
ثم جاءوک یحلفون (4/62) پھر آتے ہیں تیرے پاس قسمیں کھاتے ہوئے۔
فما ارسلنک علیھم حفیظا (4/80) ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا
فلیصلوا معک (4/102) پس وہ تیرے ساتھ صلوۃ تمام کریں۔
طائفتہ منھم ان یضلوک (4/113) ان کا ایک گروہ تجھے بہکانا چاہتا ہے۔
و علمک مالم تکن تعلم (4/113) اور لکھایا تجھ کو جو کچھ تو نہیں جانتا
قل انی امرت ان اکون اول من اسلم (6/14) کہہ کہ میں یہ حکم کیا گیا ہوں کہ میں پہلا ماننے والا ہو جاؤں

کذب بہ قومک (6/66) اور ان آیات کی تکذیب کی تیری قوم نے
ان ربک حکیم علیم (6/84) اور تیرا رب حکمت والا اور علم والا ہے۔
اس ذکر خیر "ک" کے بعد ہم "انائے محمد" کا حوالہ دیتے ہیں 9/46'110/18'26/67-29/52-62/41)

و ما انا علیکم بحفیظ 105/6'89/10 اور نہیں "میں" تمہارے اوپر بطور نگہبان نیز 35/11'86/11 تم (انسانوں) "کم" آزاد ہو۔ تم اپنی انا رکھتے ہو۔ جس کی قدر و قیمت ہے۔ یہ انسان کا بڑا اعزاز ہے۔ لیکن یہ تعلق رسول (مرکز) سے نشوونما پاتی ہے۔ انسانی معاشرہ ایک مرکز چاہتا ہے۔ تم آیات الی رسول اور مرکز سے دور رہنا چاہتے ہو۔ میں کوئی ایسا نگہبان نہیں جو تمہیں پکڑ کر ادھر لاؤں افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین (۱۰/99)

یہاں "انت" بڑا اہم ہے

حضورؐ کی ہمالہ نما استقامت خودی کا نظارہ 13 سالہ مکّی زندگی کے جانگسل مراحل سے بڑھ کر جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق، جنگ تبوک اور فتح مکہ کی معرکہ آرائی میں نظر آتا ہے۔ اور حجتہ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ کے مجمع میں حضورؐ نے جو کچھ فرمایا وہ ان کی خودی کے "**مقاما محمودا**" کا روشن باب ہے۔ آج دنیا بھر کے مفکرین و مدبرین علم نفسیات، فلسفہ اخلاق اور مستقل اقدار کا درس دینے والے اس ہستیؐ کے حضور عقیدت کے پھول ضرور پیش کرتے ہیں۔ نوع انسانی میں استحکام خودی کا یہی وہ کارنامہ ہے جس پر خود "**اللہ جل جلالہ**" اور اس کے ملائکہ بھی تبریک و تحسین کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النبی یایھا الذین امنو اصلو اعلیہ و سلمو اتسلیما (56 / 33)

اور حضورؐ کی جرات و استقامت کی یہی وہ سنت ہے جس کو ہم فراموش کر چکے ہیں۔

4۔ آزادی۔ انسان آزادی کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اور غلامی کو لعنت سے کم تصوّر نہیں کرتا۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام انسانی آزادی کے سب سے بڑے علمبردار رہے ہیں۔

تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ حمدیہ گیت موجود ہے۔ جو انہوں نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات مل جانے پر خوشی و مسرّت کے بے پایاں جذبات کے اظہار کے طور پر گایا تھا کتاب خروج کے باب 15 کی آیات 1 تا 20 پر مشتمل یہ حمدیہ گیت ہے۔ ان کے بعد ان ہمشیرہ مریم نبیہ نے ہاتھ میں دف لے کر ایک حمدیہ گیت گایا۔ سب عورتیں دف لئے ناچتی ہوئی ان کے پیچھے چلیں اور مریم ان کے گانے کے جواب میں یہ گاتی تھی "خداوند کی حمد و ثنا گاؤ۔ کیونکہ وہ جلال کے ساتھ فتح مند ہوا اس نے گھوڑے کو اس کے سوار سمیت سمندر میں ڈال دیا" (خروج 21 / 15)

قرآن میں ان کی غلامی کا تذکرہ یوں ہے۔

"ہم نے چاہا کہ جس قوم کو یوں کچل دیا گیا ہے۔ اس پر اپنا احسان کریں۔ اور انہیں اس سرزمین کا وارث بنا دیں فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھا دیں جس کے تصوّر سے انہیں کپکپی آجاتی تھی" (28 / 5-6)

علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا۔

از غلامے لذّت ایماں مجو گرچہ باشد حافظ قرآں مجو

پاکستان میں آزادی کا حصول ایک ولولہ و جذبہ تھا۔ ممتاز عالمی قانون دان محمد علی جناح صاحبؒ کی قیادت میں آزادی تو مل گئی لیکن غلامانہ قوانین انگریز ختم نہ کیے گئے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری بدستور غریب، مظلوم، بے روزگار اور مزارعین کے طبقہ کو بے گھر بے زمین اور بے روزگار رکھنے پر مصر ہے۔ وہ انگریزی قوانین کو بدلنا نہیں

چاہتی۔ اور قرآن کریم کو "سپریم لاء" بنانے پر توجہ نہیں دے رہی۔ حکومت کو زوال پر زوال آ رہا ہے۔ کوئی اس کا حل انتخابات میں تلاش کرتا ہے۔ کوئی اس کو پارلیمانی یا صدارتی نظام میں ڈھونڈ رہا ہے۔ انسان کو انسان کے بنائے ہوئے استحصالی قوانین سے نجات نہیں مل رہی۔ انگریز حکمرانوں کی جگہ نام کے مسلمان حکمران آ گئے اور بس!

5- ربوبیت عامہ

اللہ رب العلمین ہے (1 / 1) اس کی ربوبیت عامہ کو انسانی معاشرے میں جاری و ساری کرتے ہوئے رحمانیت (انقلابی پروگرام) اور رحیمیت (مستقل پروگرام) کا ایک طریق کار طے کرنا ہو گا (2 / 1) وہ خیر الرازقین ہے۔ (58 / 22) کرہ ارض پر جس قدر ذی حیات ہیں ان کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر ہے۔ (6 / 11) انسانی دنیا میں تقسیم و پیدائش رزق کی ذمہ داری اس مملکت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے۔ جو ایسے افراد پر مشتمل ہو جن کی ذات قوانین خداوندی کے مطابق نشوونما پا رہی ہو (152 / 6) انہی صفات کے ظہور سے وہ مملکت صاحب فضل عظیم بنتی ہے۔ 105 / 2 یہ مملکت زمین کو " الارض للہ " کے فلسفہ قرآنی کے مطابق پیداوار حاصل کرنے والے افراد کو بطور امانت مملکت اسلامیہ دے گی۔

بقول اقبالؒ ۔

کس امانت را بکار خود نبرد
رزق و گور ازوے بگیر اورا مگیر

یوں وسائل پیداوار اس گروہ کے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔ جو انگریز کا بنایا ہوا جاگیردار ہے۔ اور صالحین و صدیقین کے پاس وسائل پیداوار آ جائیں گے جو ان کی بہتر تقسیم سے رزق کے حصول اور انسانی غلامانہ احتیاج کا خاتمہ کر دیں گے۔

6- تعین مدارج

معاشرہ میں مدارج کا تعین ہر فرد کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار کی رو سے ہو گا (19 / 46) جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گا وہی سب سے زیادہ واجب التکریم ہو گا (13 / 49)

7- علم و عقل

خدا سمیع و بصیر 32 / 2 اور حکیم و علیم ہے۔ 110 / 2 اس کا علم بڑا وسیع ہے۔ 115 / 2 لہٰذا انسان کے لئے صاحب علم و صاحب عقل ہونا ضروری ہے ورنہ وہ جہنمی ہے۔ 179 / 7 اور علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

8- جذبات

جذبات انسانی عمل کے لئے بڑے محرک ہوتے ہیں۔ اس لئے انسان کے لئے گراں قدر متاع ہیں۔ جذبات کو بے باک نہ ہونے دیا جائے بلکہ وحی خداوندی کے مطابق ان سے کام لیا جانا چاہئے (50 / 28) جذبات کو آلہ کار نہیں بنانا چاہئے (23 / 45) جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں کی عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔ (28 / 46) جذبات کی تسکین کے لئے مختلف وادیوں میں مارے مارے پھرنے سے توانائیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ (225 / 26) آج ہماری عشقیہ شاعری کے گیت جو کردار ادا کر رہے ہیں وہ بند کر دیئے جانے چاہئیں۔

9- عدل و احسان

عدل کے معنی ہیں ہر شخص کو اس کا حق پورا پورا دینا اور احسان کے معنی ہیں۔ کسی کی کمی پورا کر کے اس کے توازن کو درست کر دینا۔ (90 / 16) دشمن سے بھی عدل کرو (2 / 5)

10- **لا اکراہ فی الدین**

قرآن کی رو سے کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس نظام زندگی کو اپنا لے۔ 256 / 2) نظام خداوندی کو دل و دماغ کی کامل رضامندی سے اختیار کرنا ہے۔ اس کا نام نفسیاتی تبدیلی ہے۔ = جس کے بغیر خارجی معاشرہ میں تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی (52 / 8، 11 / 13)

11- تحفظات

اللہ کی ایک صفت غفور ہے۔ 173 / 2 سامان حفاظت بہم پہنچانے والا۔ اس صفت کی نمود انسانی ذات سے بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا یتیم، غریب، معذور، بیوگان اور کمزور طبقات کی حفاظت ایک مستقل قدر ہے اور اسی کے مطابق قرآنی مملکت اپنی سرحدوں کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ (60 / 8) داخلی اور خارجی امن و امان کے لئے قرآن کے ساتھ شمشیر بھی ہوتی ہے۔ (25 / 57)

12- عمل تخلیق

اللہ نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے۔ 74 / 23 خدا اپنی تخلیق میں نئے نئے اضافے کرتا ہے۔ 1 / 35 لہٰذا عمل تخلیق وجہ شرف انسانیت ہے۔

13- نغمائے حیات

رہبانیت قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ 27 / 58 عمل تخلیق کے نتیجہ میں نغمائے خداوندی اور استخلاف فی الارض کے بعد ان سے قرآن کے مطابق متمتع ہونا ضروری ہے۔ 7-6 / 1، 26 / 8، 27 و 14، 20 / 17 ان میں اسراف اور بخل سے کام نہ لیا جائے۔ 142 / 6، 27-26 / 17-67 / 25

14- وحدت امت

اختلاف اور تفرقہ شرک ہے۔ 32-31/30 یہ خدا کا عذاب ہے۔ 104/3- لہٰذا اختلاف۔ شرک اور عذاب سے بچنے کا طریق وحدت امت ہے۔

15- اقدار میں توازن

صفات خداوندی کو **الاسماء الحسنی** کہا گیا ہے۔ 8/20- صفات میں افراط و تفریط الحاد کہلاتی ہے۔ جس سے توازن بگڑ جاتا ہے۔ 180/7 اسلام کے معنی یہ ہیں کہ ہر واقعہ۔ حادثہ' موقعہ اور فیصلہ کے وقت دیکھا جائے کہ اللہ کی کون سی صفت بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔ اسی کے مطابق فیصلہ اور عمل کرنا اسلام کہلاتا ہے۔

16- مکافات عمل

کوئی نتیجہ جھوٹی آرزوؤں کے مطابق مرتب نہیں ہوتا بلکہ اعمال کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ 202-201/2' 112-111/2' 123/4 مواخذہ جرائم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ 95/7'10/3 جو عمل کروگے وہی اس کا بدلہ ہوگا 147/7-90/27-39/37-

رسول کی بیوی بھی اپنے اعمال کے مواخذہ سے نہیں بچ سکتی۔ 33/29'10/66)

17- تسخیر قویٰ

قوت سب کی سب اللہ کے لئے ہے۔ وہی اس کا سرچشمہ ہے۔ 165/2

وہ قوی العزیز ہے۔ 66/11- لہٰذا تمام قوتوں کی تسخیر کے لئے اس اللہ کی مدد چاہنا مومن کی بہترین دعا ہے یوں مومن بالائے ہر بالاتر سے بن سکتا ہے۔

18- کسی کی محنت غصب نہیں کی جائے گی (70/39'39/53)

19- مال کی حفاظت یوں ایک قدر ہے کہ کوئی اس سے چھین نہیں سکتا۔ نہ ہی اسے ناحق کھا سکتا ہے۔ (188/2-29/4 اس نظام کے لئے اسے **قل العفو** کی حد تک دینا پڑے گا۔

20- جان کی حفاظت یوں مشروط ہو جاتی ہے۔ کہ جن جرائم کی سزا قتل ہو اس میں جان لی جا سکتی ہے۔ ناحق نہیں۔ 178/2-32/5-152/6

21- سکونت کی حفاظت۔ لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالنا حرام ہے۔ (85/2)

22- حفاظت عصمت معاشرے کی اہم ذمہ داری ہے۔ (4-2/24-59/33)

23- شادی میں انتخاب کا حق (3/4-19/4)

24- حسن ذوق کا حق (32/7)

25- مظلوم کو فریاد کا حق (148/4)

26- حیثیت عرفی کا تحفظ (148/4، 12-11/49)

27- امن کی ضمانت (2/38)

28- جب تک کوئی مجرم ثابت نہ ہو جائے اسے بے گناہ سمجھا جائے (16-12/24)

29- حرث (کھیتی) اور نسل کا تحفظ (2/205)

30- ماپ تول کا پورا کرنا۔ (6/153)

31- ایفائے عہد۔ معاہدات کا احترام (17/34)

32- قانون کے نفاذ سے پہلے کا جرم جرم نہیں (275/2، 22/4)

33- غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کا تحفظ (40/22) ان کے معبودوں کو گالی مت دو (109/6)

34- کسی کو سبیل اللہ سے روکنا جائز نہیں۔ (98/3)

35- جو چیزیں قدرت کی طرف مفت عطا ہوئی ہیں انہیں کسی سے روکنا جائز نہیں (20/17) ان کا انتظام اس طرح کرنا ہو گا کہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق مل جائے (10/41) اس میں پانی اور زمین آ جاتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت یقیناً ایک ایسی ہی نظیر ہے۔

36- شعوب و قبائل کی تقسیم بغرض تعارف ہے۔ (13/49)

37- صلوۃ و زکوۃ کے نظام کا قیام باعث فلاح ہے۔ (105/2) جس سے خوف و حزن کا خاتمہ ہو جانا چاہئے۔ (2/38) مساجد اسلامی نظام کے مراکز ہیں (18-17/9)

38- ہر اختلافی معاملہ میں مرکزی اتھارٹی کو حکم بنانا ہو گا اس کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوں گے۔ (65-4/64)

39- مال و دولت اور اولاد کی کشش تمہیں اسلامی نظام سے خیانت پر آمادہ نہ کردے۔ (28/8)

40- مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں (10/49) لہٰذا محروم اور سائل کا تمہارے مال میں حق ہے (19/51)

41- مومن مرد اور عورتیں صائم (روزہ دار) ہوتے ہیں (35/33) روزے رمضان کے ماہ کے فرض ہوئے ہیں۔ (185/2)

42- مومن عورتیں اپنی زینت قصداً نمایاں نہ کریں بجز اپنے محرموں کے (31/24) نگاہیں قابو میں رکھیں (31-24/30)

43- شمس اور قمر دونوں ماہ و سال کی گنتی کے لئے ہیں (97/6-5/55)

44- باہمی مشاورت (38/42)

(بقیہ صفحہ ۶۹ پر)

عالمگیر انسانیّت کے لئے منشورِ حیات

یعنی

حضور نبی اکرمؐ کا

خُطبۂ حجّۃ الوَداع

حج، ۹ھ میں فرض ہوا۔ اس سال حضورؐ خود تشریف نہیں لے گئے۔ بلکہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ ۱۰ھ میں حضورؐ نے بہ نفس نفیس حج کا ارادہ فرمایا۔ اس خبر کا عام ہونا تھا کہ سارا عرب ہمرکابی کی سعادت حاصل کرنے کے لئے اُمنڈ آیا۔ ذی قعدہ کی چھبیسویں تاریخ، حضورؐ مدینہ منوّرہ سے جانبِ کعبہ روانہ ہوئے۔ مدینہ سے باہر چھ میل کے فاصلہ پر قیام فرمایا۔ دوسری صبح حضورؐ نے احرام باندھا اور بلند آواز سے فرمایا۔

لبیك اللّٰھم لبیك۔ لاشریك لك لبیك۔ ان الحمد والنعمة لك
لبیك والملك لاشریك لك۔

ہم حاضر ہیں۔ اے خدائے بزرگ و برتر تیرے بندے تیرے حضور حاضر ہیں۔ حمد و ستائش کی مرکز تیری ہی ذات ہے اس میں کوئی اور شریک نہیں۔ حکومت صرف تیرے لئے ہے۔ اس میں کسی اور کا حصّہ نہیں۔

حضورؐ نے یہ کلمات بلند کئے اور سننے والوں نے سنا کہ لبیك اللّٰھم لبیك کی صدائے بازگشت سے تمام دشت و جبل گونج اُٹھے کہ یہ کاروانِ عشق و ذوق تمام دامنِ صحرا پہ ریت کے چمکتے ہوئے ذرّوں کی طرح تا بحارِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ تقدیس و تحمید کی ان زمزمہ باریوں سے یہ قافلۂ نور و نکہت منزل بمنزل آگے بڑھتا گیا۔ سینوں میں تڑپتے ہوئے دل۔ آنکھوں میں چمکتی ہوئی فراست۔ پیشانیوں میں مچلتے ہوئے سجدے۔ ذوقِ عبودیت کی متاعِ گراں اور آغوشِ حسنِ عمل کی کامرانیوں اور سعی پیہم کی شادکامیوں کی ایک جنت اپنے جلو میں لئے، یہ زبدۂ کائنات گروہ، یہ عصارۂ روزگار جماعت۔ یہ جیشِ خدا مست

یہ عسکرِ خود آگاہ۔ یہ حریت و مساوات کے علم بردار۔ یہ احترامِ انسانیت کے پیغامبر۔ یہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ٥ کے زندہ پیکر، ذی الحجہ کی چار تاریخ کو۔ صبح کے سہانے وقت۔ تاروں کی خنک و حسین

مکہ میں داخلہ

چھاؤں میں مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ جب کعبہ پر نگاہ پڑی تو حضورؐ نے وجد و مسرت کے والہانہ انداز میں فرمایا:۔

لا الٰه الا اللّٰه وحدهٗ لاشریك له۔ له الملك وله الحمد و یمیت وهو علیٰ کل شیءٍ قدیر۔ لَا اِلٰهَ الا اللّٰه وحدهٗ۔ انجز وعدهٗ۔ نصر عبدهٗ وهزم الاحزاب وحدهٗ۔

(ہاں! آج اس حقیقتِ کبریٰ کا عملی اعلان ہو رہا ہے کہ) خدا کے سوا کوئی حاکم اور آقا نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ سرداری اور ستائش سب اس کے لئے زیبا ہے۔ وہی ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور وہی ہے جو موت دیتا ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ اس خدائے واحد کے سوا کوئی حاکم نہیں (میرا سرِ نیاز اس کی بارگاہِ صمدیت میں جھکتا ہے جس نے) اپنا وعدہ (یوں) پورا کیا۔ اس نے اپنے (بے سرو سامان) بندے کی مدد کی اور باطل کے تمام جیوش و عساکر کو شکست دے دی (اور حق کی اس طرح فتح ہوئی)۔

نویں ذوالحجہ کو جمعہ کے روز، یہ جمعیتِ اسلامیہ، یہ اُمتِ قانتہ، یہ ملتِ مسلمہ، یہ قدوسیوں کی جماعت رضؓ عرفات کے میدان میں جمع ہو گئی کہ اپنے امام و مقتدیٰ سے تشکیل حکومتِ الٰہیہ کا اعلان عظیم اپنے کانوں سے سن لیں تاکہ اس کے بعد اسے کامل حتم و یقین کے ساتھ دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیں۔ دوپہر ڈھل گئی تو کمبل کے خیمہ سے وہ ذاتِ گرامیؐ جلوہ بار ہوئی جس کے ایمان و عمل کے درخشندہ

خطبہ حجۃ الوداع

نتائج اس وقت یوں سامنے ضوفشاں تھے۔ حضورؐ ناقہ پر سوار ہوئے تو تکبیر کے غلغلہ انگیز نعروں سے فضا مرتعش ہو گئی۔ آپ نے ناقہ پر سوار وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو قیامِ نوعِ انسانی کے لئے منشورِ بالغہ ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

الآ! کل شیءٍ من امر الجاهلیة تحت قدمی موضوع۔

ہاں! جاہلیت کے تاریک زمانہ کے تمام آئین و دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔

اللہ اکبر! یہ اعلان اس کی طرف سے ہو رہا ہے جسے اس مقام سے، آج سے دس سال قبل، ان ہی آئین و دساتیر کے علمبرداروں نے چاروں طرف سے یورش کر کے نکالا تھا۔

اس کے بعد فرمایا:۔

ایها الناس۔ الا ان ربکم واحد۔ وان اباکم واحد۔ الا لا فضل العربی علی عجمی ولا لعجمی علیٰ عربی۔ ولا لاحمر علیٰ اسود ولا لاسود علیٰ احمر۔ الا بالتقویٰ۔

اے نوعِ انسانی (سن رکھو کہ) تمہارا سب کا رب ایک ہے۔ اور تم تمام ایک ہی اصل کی

شامل ہو۔ اس لئے عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر۔ کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

غور کیجئے۔ شرفِ انسانیت کی نمود و بالیدگی اور حریت آدمیت کے عروج و ارتقا کی راہ میں سب سے بڑے سنگِ راہ، انسانوں کی جغرافیائی تقسیم (وطنیت) اور نسبی تفوق (نیشنلزم) کی حدود و قیود ہیں۔ اس لئے اس منشورِ حریت و مساواتِ انسانیہ میں سب سے پہلے باطل کے ان ہی انسانیت سوز معیاروں پر خطِ تنسیخ کھینچا گیا۔ اس طرح تمام نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری قرار دے کر، صرف شرفِ انسانیت کو باعثِ تکریم اور وجہ تعظیم بنا دیا گیا جو اتباعِ قوانینِ الٰہیہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس فطری تقسیم کی طرف اشارہ کیا گیا جس کی رُو سے انسان دو جماعتوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ یعنی ایک وہ جماعت جو تمام انسانوں کی محکومیت سے انکار کر کے صرف ایک خدا کی حکومت کو تسلیم کرے۔ اور دوسری وہ جماعت جو انسانوں کے خود ساختہ قوانین و دساتیر کے سامنے اپنی گردن جھکا دے، خواہ وہ قوانین خود اپنے وضع کردہ ہوں یا دوسرے انسانوں کے مسلط کردہ۔ اوّل الذکر جماعت (امّتِ مسلمہ) اس یک جہتی اور ہم رنگی، اشتراکِ نصب العین اور وحدتِ مقصد کی بنا پر باہمدگر بھائی بھائی۔ اور اس حقیقتِ کبریٰ سے انکار کرنے والے انسان (کافر) دوسری سوسائٹی کے افراد۔ اس لئے فرمایا کہ

ان کل مسلم اخو مسلم وان المسلمین اخوۃ۔

یاد رکھو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور اس طرح تم روئے زمین کے مسلمان رشتۂ اخوّت میں منسلک اور مسلک مودّت سے منوط ہو۔

اور یہ رشتۂ اخوّت و ناطۂ مودّت محض ایک نظری عقیدہ نہیں بلکہ یاد رکھو کہ

ان دمائکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا۔ فی بلدکم ھذا۔ الی یوم تلقون ربکم۔

تمہارا خون اور تمہارا مال اور تمہاری آبرو قیامت تک کے لئے ایک دوسرے کے نزدیک اسی طرح محترم ہونی چاہیئے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں وجہ احترام ہے۔

یاد رکھو:۔

لا ترجعوا بعدی ضلالا یضرب بعضکم رقاب بعض وستلقون ربکم فیسئلکم عن اعمالکم۔

کہیں میرے بعد اختلاف و مرکزیت کی صراطِ مستقیم چھوڑ کر تشتت و افتراق کی گمراہی نہ اختیار کر لینا کہ خود ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگ جاؤ۔ یاد رکھو! تمہیں خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔

یہ وحدت و یک جہتی صرف تمہارے نظام سے قائم رہ سکے گی۔ اس نظام کی بنیاد قرآن پر ہے۔ اور یہی قرآن

ہے جسے میں اپنے بعد تمہارے لئے چھوڑ جاؤں گا۔

وانی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہٗ، ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ۔

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ۔

یہ ہے تمہارے نظام کا ضابطۂ قانون۔ اور اس قانون کو نافذ کرنے والا تمہارا امیر جس کی اطاعت بمنزلہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے ہوگی۔

ان امرکم علیکم عبد مجدع اسود یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ واطیعوا

اگر کوئی حبشی، بینی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تمہیں قرآن کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرو۔

اس نظامِ دینی میں ہر رکن کو اس کی اپنی جگہ پر رکھو۔ اُس کے مقام سے اُسے اونچا نہ لے جاؤ۔ اس لئے کہ قوموں کی ہلاکت و بربادی اسی غلو سے ہوئی۔

ایاکم والغلو فی الدین۔ فانما اھلک قبلکم الغلو فی الدین۔

دین میں غلو مت کرو کہ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئیں۔

پھر فرمایا کہ یاد رکھو قوموں کی تعمیر و تربیت میں آغوشِ مادر کا حصہ بڑا بنیادی ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے نظامِ مدنیت میں عورتوں کی صحیح پوزیشن کو نظر انداز نہ کر دینا۔

فاتقوا اللہ فی النساءِ۔ ان لکم علیٰ نساءکم حقا ولھن علیکم حقا۔

عورتوں کے معاملہ میں (بھی) قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یاد رکھو تمہارے عورتوں پر اور عورتوں کے تم پر حقوق ہیں (ان حقوق کو نظر انداز مت کرو)۔

یہ فرما کر آپؐ نے مجمع پر ایک غائر نگاہ ڈالی۔ قریب ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم اس شمع نبوّت کے گرد تھا۔ وہ گروہِ عظیم جس کی گردنیں دنیا کی کسی طاغوتی قوّت کے سامنے نہیں جھک سکتی تھیں، اپنے خدا کے حضور سر جھکائے کھڑا تھا ——— اس سعادتِ عظمیٰ کی فراوانی پر شاداں و نازاں جو انہیں مجاہدانہ سعی و عمل کے سلسلے میں بارگاہِ ربّ العزّت سے اس طرح عطا ہوئی تھی، اور ان ذمہ داریوں کے بارِ گراں کے احساس سے لرزاں و ترساں جو نوعِ انسانی کی امامت و قیادت کے سلسلے پر ان پر عائد ہو رہی تھیں۔ حضورؐ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا کہ

انتم مسئولون عنی فما انتم قائلون۔

تم سے خدا کے ہاں میری بابت پوچھا جائے گا۔ کہو تم کیا جواب دو گے؟

لاکھوں زبانیں ایک ہی وقت پکار اٹھیں کہ ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔"

کتنی عظیم انسان ہے یہ شہادت جو کسی انسان کو اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد میسّر آجائے۔ آپ نے

آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا:-

اَللّٰھُمَّ اشْھَد ــــ اے خدا تو گواہ رہنا۔

جس شاہد عادل کی گواہی کی استدعا کی گئی تھی اس نے اپنی شہادت کا ان الفاظ میں اعلان کر دیا کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (۵/۳)

آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ اور (اس طرح) اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کو بطور نظام حیات منتخب کر دیا۔

ہزاروں آنکھیں تھیں جو اتمامِ نعمت کی اس بشارتِ عظمیٰ پر فرطِ مسرت سے عطر پاش تھیں۔ لیکن سینکڑوں آنکھیں ایسی بھی تھیں جو اپنے محبوب کی جدائی کے احساس سے شبنم فشاں تھیں، اس لئے کہ انہوں نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ تکمیل دین کے بعد یہ ذاتِ گرامی دنیا سے تشریف لے جائے گی اور یہ آیۂ مقدسہ اس آنے والی ساعتِ فراق کی پیش آہنگ ہے۔[1]

خطبہ سے فارغ ہو کر حضور جانب منیٰ روانہ ہوئے۔ اس شاہانہ جلوس کا انداز یہ تھا کہ ایک "حبشی غلام" (حضرت بلالؓ) ناقہ کی مہار پکڑے تھے اور ایک "غلام ابن غلام" (حضرت اسامہ بن زیدؓ) شریک سواری، کپڑا تان کر فرقِ مبارک پر سایہ کئے تھے۔ اور اونٹنی پر ایک پالان تھا جس کی قیمت ایک روپیہ سے زائد نہ تھی۔ خدا کی طرف سے تکمیل دین کا اعلان ہو چکا تھا اور یہ دین اپنی عملی شکل میں خدا کی زمین پر نافذ۔ یعنی نظامِ انسانیت مشیّت کے صحیح خطوط پر متشکل ہو چکا تھا۔ وہ نظام جس پر چلنے کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا تھا لیکن جس میں انسان کے خود ساختہ قوانین و دساتیر کی آمیزش نے اس کی ہیئت بدل ڈالی تھی۔ آج اس کی تمام کثافتیں اور آلودگیاں یکسر دُور ہو گئیں اور وہ نظام اُسی حالت پر آگیا جس پر اسے خلّاقِ فطرت نے متعیّن کیا تھا۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ

زمانہ اپنے مرکزِ اصلی پر

ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللّٰہ السمٰوٰت والارض۔

زمانہ پھر پھرا کر آج پھر اسی نقطہ پر آگیا جس پر اللہ نے اسے تخلیق ارض و سمٰوٰت کے وقت متعیّن کیا تھا۔

یہی مقصودِ مشیّت تھا۔ یہی انسانی تگ و تاز کا منتہیٰ تھا۔ یہی اس کاروانِ رشد و ہدایت کی آخری منزل تھی جو کبھی جودی کی چوٹیوں پر ٹھہرا، اور کبھی شام کے سبزہ زاروں میں رُکا۔ کبھی نیل کی وادیوں میں گھوما، اور کبھی سینا کے پہاڑوں سے گذرا۔ کہیں یروشلم کے میدانوں میں اُترا اور پھر بطحا کے صحراؤں میں فروکش ہوا۔ یہی وہ جنّت تھی، جو جنّت سے نکلے ہوئے آدم کو اس کے اعمال کے بدلے میں ملنی تھی اور مل کر پھر نہ چھننی تھی، بشرطیکہ وہ اس نظام پر عمل پیرا رہتا۔

---

[1] اس آیت کے زمانہ نزول کے متعلق اختلاف ہے۔

اس اعلانِ عظیم کے بعد حضورؐ نے پھر مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

الا ھل بلّغت

کیوں؟ میں نے پیغامِ خداوندی تم تک پہنچا دیا؟

سب بول اُٹھے۔ ہاں پہنچا دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ

اللّٰھم اشھد

اے خدا تو گواہ رہنا۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:۔

فلیبلغ الشاھد الغائب

جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ اس پیغام کو ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔

مدینہ کو واپسی

اور اس طرح اس پیغامِ خداوندی کی وسعتوں کو (ابدیت) سے ہم کنار کر دیا۔

تکمیلِ دین کے اس فریضہ مہمہ سے فارغ ہو کر یہ کاروانِ سعادت و رحمت، مراجعت فرمائے مدینہ ہوا۔ نواحِ مدینہ پر نگاہ پڑی تو فرمایا:۔

اللہ اکبر۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ۔ لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر۔ آئبون۔ تائبون۔ عابدون۔ ساجدون۔ لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہٗ۔

کبریائی و جبروت سب خدا کے لئے ہے۔ اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔ وحدہ لاشریک۔ حکومت صرف اسی کے لئے ہے اور ستائش و زیبائش کی مرکز اسی کی ذات۔ اس نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں جو اٹل ہیں۔ لوٹے آرہے ہیں اس کے بندے' ساری دنیا سے منہ موڑ کر صرف اسی کے آستانہ کی طرف رُخ کئے ہوئے (تائبون) تمام طاغوتی قوتوں کی سرکشیوں کو پامال کر کے صرف اسی کی محکومیت کا قلادہ زیبِ گلو کئے ہوئے (عابدون) ساری دنیا کے سامنے غیورانہ اٹھنے والی پیشانیاں اس کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز (ساجدون) تمام دنیا سے خراجِ تحسین وصول کرنے والے اس مرجع حسن و خوبی کی حمد و ستائش میں زمزمہ بار۔ اس لئے کہ اس نے اپنا وعدہ سچا کیا۔ اپنے بندے کی مدد کی اور تمام مخالف قوتوں کو شکست دی۔ آرہے ہیں خدا کے بندے لوٹ کر۔

استقبالِ خسروانہ

نظامِ انسانیت کی امامتِ کبریٰ کا یہ مرکزِ اوّلین، تکمیلِ دین و اتمامِ نعمت کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لئے بہ کمالِ حسن و رعنائی واپس آرہا ہے۔

اور مدینہ کی گلیوں کا ذرّہ ذرّہ اُبھر کر کہہ رہا ہے کہ

اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا　　اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا!

اے زمین از بارگاہت ارجمند　　آسماں از بوسۂ بامت بلند
از تو بالا پایۂ این کائنات　　فقر تو سرمایۂ این کائنات!
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر!
از جبین وچشم ہائے ما بگیر!

شکان ارضی، حمد و ستائش میں اس طرح نغمہ سنج و زمزمہ بار تھے اور آسمان سے خدا اور اس کے فرشتے اس تکمیل کار اور حسن مآب پر یہ کہہ کر تبریک و تہنیت کے پھول برسا رہے تھے کہ

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (۳۳/۵۶)

کس قدر مبارک ہے وہ آغاز جس کا انجام اس قدر حسین ہو۔ اور کیسی پُر بہار ہے وہ شاہراہِ زندگی جو اس آغاز و انجام کے نقاط سے مربوط ہو۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ حَمْدًا كَثِيْرًا۔

("معراج انسانیت" از پرویز)

طلوعِ اسلام

خطبۂ جلیلہ کا متن اس امر کی شہادت پیش کرتا ہے کہ اسے حضور نبی اکرمؐ کا ارشادِ گرامی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود، اس میں بھی ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے۔

حضورؐ نے یہ خطبۂ حج کی تقریب پر، عرفات کے میدان میں ارشاد فرمایا، جہاں (کہا جاتا ہے کہ) ایک لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ سامعین موجود تھے۔ انہوں نے اسے جس انہماک اور توجہ سے سنا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اس میں اُمت کی راہ نمائی کے لئے ایک بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے۔ یعنی حضورؐ نے فرمایا کہ

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ وہ چیز کیا ہے؟　　کتاب اللہ　　(صحاح)

لیکن آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ بعض روایات میں، اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں دو ایسی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے انہیں مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ اور وہ ہیں۔

کتابُ اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ۔　　(حیاتِ محمدؐ۔ محمد حسین ہیکل مصری۔ صفحہ ۴۹)

اور طبری میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے انہیں مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ اور وہ دو چیزیں ہیں۔

کتابُ اللہ اور عترتی (میری اولاد)　　(تاریخ طبری۔ جلد اوّل۔ حجتہ الوداع)

آپ غور فرمایئے کہ اس قسم کے عظیم اجتماع میں، ایسے بلیغ اعلامیہ کے دو الفاظ کے آگے منتقل ہونے میں اختلاف کا یہ عالم ہے تو تیئس سال کے عرصہ میں، جلوت اور خلوت میں حضورؐ کے ارشاد فرمودہ کلمات، دو اڑھائی سو سال بعد مرتب ہونے میں اختلافات کی کیا صورت نہ ہوگی؟

(٠)

نقد و نظر

نام کتاب : رسولِ صادقؐ
ماخذ : تحریرات علامہ محمد عنایت اللہ خاں المشرقی۔
ترتیب و تلخیص : غلام قدیر خواجہ ایڈووکیٹ۔
پبلشر : جنگ پبلشرز لاہور۔
صفحات : ۹۸ ، قیمت : ساٹھ روپے۔

سیرتِ نبویؐ کے سدا بہار موضوع پر جنگ پبلشرز کی کتابوں میں ایک خوبصورت اضافہ زیرِ نظر کتاب ـــــ "رسولِ صادقؐ" ـــ ہے، یہ علامہ مشرقی کی کسی کتاب کا نام نہیں بلکہ محترم غلام قدیر خواجہ ایڈووکیٹ چیئرمین المشرقی اکیڈمی پشاور نے علامہ صاحب کی گراں قدر تصانیف تکملہ جلد اوّل حدیث القرآن اور مقالات، دونوں جلدوں سے کچھ جواہر پارے لے کر اُسے مذکورہ عنوان کے تحت ترتیب دیا ہے۔

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب کا عنوان ہے رسولِ صادقؐ، جس میں رسالتمآبؐ کی عالمگیر تحریک کے متعلق بتایا گیا ہے کہ

> "قرنِ اوّل میں چلائی ہوئی تحریک جو تیئس برس تک نبیؐ نے خود چلائی اور ان کے بعد کئی قرنوں تک عالمگیر بن جانے کی کوشش میں نبیؐ کے پیدا کئے ہوئے عظیم الشان انسانوں نے چلائی، کوئی "مذہب" بنانے والی یا محمدیؐ جماعت پیدا کرنے والی یا یہودیوں اور عیسائیوں اور بودھوں وغیرہ کی طرح دینی گروہ قائم کرنے والی تحریک نہ تھی جس کے چکر میں مسلمان آج خود پھنس کر اس کو ایک مذہب بنائے بیٹھا ہے اور اس "مذہب" کو آسان سے آسان تر بنانے میں مشغول ہو کر جنت کے خوابوں میں مگن ہے بلکہ وہ خلاقِ ارض و سما کی طرف سے صرف عرب نہیں بلکہ انسان

کی پوری نوع کو اپنی لپیٹ میں لینے کی ایک تحریک تھی تاکہ اس پوری نوع سے خدا مقصد پیدائش کائنات تک پہنچنے کا کام لے جب تک دو اور دو چار کی طرح رسول صلعم کے لائے ہوئے پیغام یعنی قرآن کو اس کے اصلی رنگ میں لاکر یہ ثابت نہ کر دیا جائے نہ رسولؐ کو سچا نبی ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ قرآن کے خدا کا پیغام ہونے کے بارے میں کوئی قطعی یقین پیدا ہو سکتا ہے"۔ ص ۳۴

اسی باب میں بتایا گیا ہے کہ رسولؐ اللہ چالیس پینتالیس برس کی عمر میں علم کے ایک بحرِ بیکراں اور صحیفۂ فطرت کے ایک بے پناہ طالب علم تھے، لہٰذا مسلمان مفسرین نے اُمّی کے لفظ کی جو تشریح کی ہے کہ امیین سے مراد "ان پڑھ عرب" اور النبی الامی سے مراد "ان پڑھ رسول" ہے، شرمناک ہے اور مسلمانوں کی پستیٔ فکر کی روشن دلیل ہے۔ اپنے اس موقف کی وضاحت قرآن حکیم کے حوالہ سے درج ذیل الفاظ میں کی گئی ہے۔

"هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

"خدا وہ ذات ہے جس نے کتاب خدا سے بے بہرہ اہلِ عرب میں انہی میں سے رسول بھیجا کہ وہ ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور یقیناً یہ لوگ اس سے قبل صریح گمراہی میں تھے"۔

اگر رسولؐ ان پڑھ تھا تو وہ کس طرح خدا کی آیات پڑھتا (یتلوا) تھا کس طرح ان کو الکتب کا علم دیتا تھا، اس آیت سے تو ثابت ہوتا ہے کہ رسولؐ بڑا پڑھا ہوا اور بڑا عالم تھا۔

(۲) اُمِّیُّوْنَ کا لفظ قرآن میں اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) سے تمیز کرنے کے لئے آیا ہے۔ یعنی یہ وہ عرب لوگ ہیں جن پر اس سے پہلے کوئی کتاب نہ اُتری تھی۔ جیسا کہ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا (۳-۲)

"یعنی اے محمدؐ! ان لوگوں سے جنہیں (اس سے قبل) الکتب دی گئی تھی، نیز ان اُمیوں سے (جنہیں کوئی کتاب اس سے پہلے بھیجی نہ گئی تھی) پوچھیں کہ کیا تم ایمان لے آئے ہو! اگر یہ تسلیم کر لیں تو بے شک ہدایت پا گئے"۔ یہاں صاف طور پر اہلِ کتاب کے مقابلے میں امیین کا لفظ آیا ہے اور مقصد دونوں گروہوں کو ہدایت کی طرف بلانا ہے کیونکہ اہلِ کتاب بھی ان کے پاس الکتب ہونے کے باوجود گمراہ ہو گئے تھے۔

(۳) سورۂ بقر میں اسی نقطۂ نظر سے اہلِ کتاب کے متعلق کہا۔

وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ

یعنی ان یہود و نصاریٰ میں سے (جن کو کتاب دی گئی تھی اور وہ اس کتاب کی تعلیم بھول گئے) ایسے لوگ بھی ہیں جو امیین (یعنی اہلِ عرب کی طرح جن پر کوئی کتاب اب تک نازل نہ ہوئی) کتاب کا علم نہیں رکھتے (اور اس میں کورے ہیں اور اگر جانتے بھی ہیں تو) سوائے (اس کے کہ ان کی کتاب ان کی) آرزوؤں (اور خواہشاتِ نفسانی کو پورا کرتی ہے کچھ نہیں جانتے) اور وہ صرف گمانوں میں (بھٹک رہے) ہیں"۔ گویا کہا کہ اہلِ کتاب اسی طرح اپنی کتاب سے بے علم ہو گئے ہیں جس طرح کہ عرب قرآن نازل ہونے سے پہلے تھے اور اسی لئے ان کی حیثیت اہلِ عرب سے بڑھ کر نہیں۔

..... ان سب آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ النبی الامّی سے مراد کتاب سے بے بہرہ اہلِ عرب کا رسولؐ تھا نہ کہ ان پڑھ رسول۔ مسلمانوں کو شرم آنی چاہیئے کہ انہوں نے دنیا کے سب سے بڑے صاحبِ علم رسولؐ پر افترا باندھا۔ کتابِ خدا کو قرآنِ حکیم میں جا بجا علم کہا گیا ہے اور اسی لئے اہلِ عرب کو اُمّی کہا کہ وہ رسولؐ کے آنے سے پہلے کتاب سے بے بہرہ تھے۔" (ص ۳۳)

دوسرے باب میں "وحی" کے عنوان سے سورۃ النجم میں نبی اکرمؐ کے بلند مقام، مکہ کی جمالی اور مدینہ کی جلالی زندگی کے حوالہ سے واضح کیا گیا ہے کہ اگر آج کا مسلمان خدا کی طرف آئے تو دنیا پر غالب آ سکتا ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ہے، خدا۔ اس باب میں خدا کے صحیح تصور اور مقام کے متعلق بتایا گیا ہے کہ

"۱۔ خدا ہے اور خالق زمین آسمان کی حیثیت میں ہر جگہ اسی کا بنایا ہوا قانون چل رہا ہے۔ کسی دوسرے حاکم کے قانون پر چلنے میں انسان کو نقصان اور بالآخر اجتماعی ہلاکت ہے۔

۲۔ کسی دوسرے حاکم کے قانون پر چلنا ہی اس کو خدا کے ساتھ شریک کرنا بلکہ اس سے بہتر بنا دینا ہے۔ یہی وہ شرک ہے جس کی "بخشش" نہیں۔ دوسرے لفظوں میں جو قوم اس پر چلے گی اس کی مادی قوتیں بالآخر سلب ہو جائیں گی اور وہ صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گی۔

۳۔ خدا کے قانون پر چلنا ہی خدا کو "ماننا" ہے۔ اس سے ہٹ کر لفظی ماننا کوئی ماننا نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔

(۲ — ۸)

۴۔ خدا کا قانون اس کی فطرت سے اخذ کیا ہوا قانون ہے، خواہ وہ قانون انسان نے خود اخذ کیا ہو یا کسی باخبر انسان نے بنایا ہو۔" (ص ۵۷)

چوتھے باب میں مقامِ انسان کی وضاحت اور پانچویں میں صحیفۂ فطرت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہی کائنات میں واضح حقیقت ہے۔

"حیرت ہوتی ہے کہ سچائی کے موجودہ ملائی اور صوفیائی تخیل کے خلاف قرآنِ حکیم میں (خدا اور قرآن وغیرہ کو چھوڑ کر) صرف ایک شے ہے جس کو بار بار اور نہایت تاکید کے ساتھ "حق" یعنی سچائی کہا گیا ہے اور وہ صرف خدا کی بنائی ہوئی فطرت ہے۔ یہ حقیقت اس اصرار اور تاکید کے ساتھ واضح کی گئی ہے کہ مسلمانوں کا زوال کے زمانے سے اس کو قطعی طور پر نظر انداز کر کے خدا کی بنائی ہوئی فطرت کو لاشے اور دنیا کو مردار سمجھنا اس امر کا ثبوت ہے کہ قرآن اس وقت تک متروک و مہجور ہو چکا تھا۔ اسی فطرت کو نظر انداز کرنے سے موجودہ اسلام میں جھوٹ، وہم، ظن اور گمان اس قدر شامل ہو گئے ہیں کہ اب دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ قلندری، فقیری، صوفیائیت، پیری مریدی، مجذوبیت اور مکر و فریب کے تمام جال جو لوگوں نے حقیقت یا غیب دانی کے نام سے پھیلا رکھے ہیں، اس باعث سے ہیں کہ مسلمان کو علم نہیں رہا کہ از روئے قرآن حقیقت کیا ہے اور حق کے بارے میں خدائے عزوجل کی تصدیق کس شے پر ہے؟ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۱۶:۳)

"آسمانوں اور زمین کو خدا نے سچائی کے ساتھ پیدا کیا وہ اس شے سے بلند ہے جو لوگ اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ گویا فطرت کی حقیقت پیدائش خدا ہے اور پیدا کردہ شے پیدا کرنے والے کے ساتھ برابر نہیں ہو سکتی۔" (ص ۷۲-۷۱)

چھٹا باب مشتمل ہے علامہ صاحب کے اس طویل خط پر جو انہوں نے ۱۳ ستمبر ۱۹۵۴ء کو دنیا بھر کے سائنس دانوں کو لکھا تھا کہ انسان جو کہ مذہب، نسل، رنگ، قومیت، خواجگی، غلامی، سرمایہ داری، مزدوری، تعصب، عصبیت، جمہوریت، اشتراکیت وغیرہ وغیرہ کے لاتناہی جھگڑوں میں پھنسا ہے اس کو پھر وحدت میں پرونے کی تگ و دو کریں تاکہ یہ صحیفۂ فطرت کو اپنی مجموعی طاقت سے فتح کر سکے اور دنیا میں واقعی علم کی حکومت قائم ہو۔

ساتویں اور آخری باب میں محترم غلام قدیر خواجہ صاحب نے نگاہِ بازگشت کے طور پر کہا ہے کہ

"اگر غور سے دیکھا جائے تو دنیا میں قوموں کی ترقی کا سب سے بڑا اگر افراد کے ذہنوں میں ایک غیر پیچیدہ اور سیدھے سادے دستور العمل کا ہونا ہے جس کی بنیاد خدا، مذہب، جماعت عصبیت اور آخرت کے سیدھے سادے تخیل پر ہو اور اس میں دنیاوی اور دینی، فوری اور آخری دونوں نفعے موجود ہوں۔ گوشت اور خون سے بنے ہوئے انسان کو چونکہ جسمانی موت سے بالآخر دو چار ہونا ہے اور اس کی فکری وابستگی اس سے ہے کہ مرنے کے بعد اس کو کیا ہوگا، اس لئے فطرت کے خشک اور بے حس قوانین سے اس کا پورا لگاؤ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ

اس لگاؤ میں انسانی عقیدت اور امید کی چاشنی ہو۔ یہی وہ بات تھی جس کو اسلام نے بدرجہ اتم قائم کر کے مسلمانوں کی مختصر سی جماعت سے قرنوں تک وہ حیرت انگیز عمل کرائے جس نے اسلام کی ابتدائی تاریخ پر چار چاند لگا دیے تھے۔" صـ ۹۶

کتاب کے صفحات اگرچہ تھوڑے ہیں لیکن کمپیوٹر کی باریک کتابت کی وجہ سے خاصا مواد سمٹے ہوئے ہے، اس کے مندرجات ہر صاحب فہم کو دعوتِ فکر و انقلاب دیتے ہیں۔

یہ کتاب نہ صرف پبلک اور کالج لائبریریوں بلکہ ہر گھر میں ہونی چاہیئے تاکہ نوجوان نسل کو مذہبی اور سیاسی فرقہ بندیوں کے پیدا کردہ بحرانوں سے نکال کر قیامِ عدل و احسان کی کوئی سبیل پیدا کی جا سکے۔

بقیہ : اکیسویں صدی کے تقاضے۔

45- سود اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا (30 / 39) یہ معاشی نظام سے متعلق ہے۔ جو ان مستقل اقدار کو اپنائیں گے اللہ ان کی مدد کرے گا۔

و کان حقا علینا نصر المؤمنین (30 / 47)

اور مومنین کی مدد کرنا ہم پر ایک حق ہے۔

ان وعد اللہ حق (30 / 60) اور اللہ کا وعدہ حق (سچ) ہے۔ (جاری ہے)

بچّوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

چلنا

(١٠)

اکڑ کر چلنا | تکبّر سے اکڑ کر مت چلو۔

وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ (٣١/١٨)

"زمین پر اکڑ مت چلو۔"

نہ ہی بیماروں کی طرح سر جھکاتے، اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے چلو۔ بلکہ میانہ روی سے چلو۔

وَ اقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ ٥ (٣١/١٩)

"اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو۔"

نگاہیں نیچی رکھو | نگاہیں نیچی رکھ کر چلو۔ راہ گزر عورتوں کو بے حیائی سے مت گھورو۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ٥ (٢٤/٣٠)

"اے رسولؐ! مومن مردوں سے کہدو کہ نگاہیں نیچی رکھ کر چلا کریں اور بلاضرورت اِدھر اُدھر نہ دیکھا کریں۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔"

قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ (٢٤/٣١)

"مومن عورتوں سے بھی کہدو کہ نگاہیں نیچی رکھ کر چلا کریں اور بلا ضرورت اِدھر اُدھر نہ دیکھا کریں۔"

خیالات نیک رکھو | غیر عورتوں یا مردوں

کی طرف بُری نظر سے دیکھنا تو ایک طرف دل میں بھی بے حیائی کا خیال نہ آنے پائے اس لئے کہ

یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَ مَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ ۝ (۴۰/۱۹)

"اللہ نگاہ کی خیانت اور دل کے رازوں تک سے واقف ہے۔"

نوٹ :-

یہ جو کہا گیا ہے کہ 'نگاہیں نیچی رکھ کر چلو' تو اس سے مطلب یہ ہے کہ راہ چلتی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کو گھورتے نہ پھرو۔ شریفوں کی طرح چلو اور اپنی نگاہوں کو بے باک نہ ہونے دو۔

وہ شخص مومن نہیں جو پیٹ بھر کر کھائے
اور اس کا ہمسایہ اس کے پاس بھوکا رہے

حدیثِ نبویؐ

(1) All those "Moulvis" who had reached the age of superannuation, should he pensioned off. In other words, their old age security should be fully guaranteed.

(2) All those who were still young or beginners should be given priority in being admitted to modern schools and colleges, thus acquiring modern skills and enlightenment just as their contemporary compatriots.

(3) After completion of their education they should again be given top priority in acquiring jobs. None should he left unemployed.

(4) While the existing lot were being absorbed in the economy of the country, the Darul Ulooms and deen-i-madaris, and they were not many in 1947, which manufactured maulvis in these factories should be closed down and no new ones should ever he allowed to be established.

Such was a simple but effective plan. The issue and its solution is exclusively economic. M.A.H. Ispahani in his book "Quaid-e-Azam as I knew Him" records an incident which both surprised and hurt him to the quick. In the course of the parliamentary Board meeting (1936) the Maulanas estimated a Sum of Rs. 50,000 for propaganda purposes. Of course, the league had not even fifty coppers in its coffers. The workers were expected to work with whatever resources they could muster and to produce positive results. Disappointed the Maulanas drifted in the direction of the Hindu Congress and conducted propaganda for the Congress party which could meet their financial demands. Indeed there could not be a more diabolical example to prove the economic reason for the creation and maintenance of the priestly class.

I am not aware if Quaid's plan is documented fully in these four parts in his papers or in Allama Parwez's papers. May be someone, some day, will be able to discover further details about it. Never the less, I thought I should take this opportunity for I think it is my duty, to put on record what I know. Of course, my source of authority is Allama Parwez alone and I am glad I was able to get this information from him and glad that I am able to communicate it to you.

Quaid-e-Azam and Mullahism

By
MISS SHAMIM ANWAR

The contents of my talk may be a little off the basic theme of todays declamation, but it will not be entirely irrelevant.

Indeed today, as Ghalib has lamented, Muslims , (nay, I would Say Ghalib has taken all human kind in his sweep), has fallen into the depth of degradation. Peasons are many, but they are all knotted together by the one Single and absolute factor, namely, "Thought - control" by the priest craft, engendering a regressive and negative Mullah mentality. Haman, the high Priest , is the kingpin of the evil system, for even Pharaoh and Qaroon cannot survive without him. To the readers of Talu-e-Islam literature, these statements are all too familiar; I have how-ever, introduced this point for a special reason namely that the Quaid-e-Azam had a plan to do away with Mullahism as an institution and as a mentality once Pakistan was established, and we had a state of our own.

The Quaid's leadership had already undermined and weakened the Mullah's arrogance and hold on the peoples minds. As early as 1938 he had declared with confidence that the Muslim League had "certainly freed you from that undesirable elements of Maulvis and Maulanas." And then before ad after Independence, in the years 1946 and 1948 he assured the Muslim India and the world at large that Pakistan would never be a theocratic state or anything like it. At one point it was very well said that every Muslim must be his own priest with his own copy of the Quran. Even these brief and locanic references vindicate the fact as to how well the Quaid understood that the Mullah was a later and an extraneous element to the Quranic System and an addition in an Islamic State. To me it has always been an intriguing phenomenon to know as to why an individual would want to be a Mullah. So it often formed the Subject of discussion with Allama Parwez. That is how one day he spelt out Quaid's plan to do away with these "undesirable elements" , a plan which unfortunately could not be implemented for he left us and this world too soon in the midst of untold problems created by the enemy in a calculated manner to make Pakistan still-born. After his demise, Pakistan was hijacked by all those elements, secular and clerical, who had opposed its creation. So naturally nothing was done about it.

Quaid-e-Azam's plan was to attack this institution economically, because according to him the problem of the Mullah was economic, the problem of his stomach and his daily bread. If he could be given economic security and dignity and Self-respect, the very raison d' etre of his existence would he nullified. As I understood from Allama Parwez, Quaid's plan had four parts;

However, his sincerity to the humanitarian cause is indisputable. .

It cannot be repeated enough that whatever the motive, at least, to all appearances, the war has been and continues to be a crusade in the sense that the governments of the Christian world have so far been virtually united against the Bosnia Muslims, and the old time Christian crusade atrocities have been and still are being repeated, --- with two main discredit differences: the actual fighting has been left to one representative nation, and that nation has been left to outpace all the old-times recorded excesses. Even the phrase "law of the jungle" is inadequate for describing the Serbian savagery, which now is in a class by itself.

Nothing written here should be taken as overlooking the excellent performance of the UN task force under most difficult conditions, in particular, of Gen. Phillipe Morillon; or the real solicitude, even sorrow, of the peoples of America, Australia, New Zealand and of most of Europe over all that is happening in Bosnia. In fact, it is their profound concern, often irrepressibly voiced, that knocks the bottom out of the crusade myth of the twentieth century! The world today looks upon humanbeings as humans and not as cattle branded with the name of this or that religion.

As this goes to the press, UN peace deliberators have shifted their venue to Athens and Bosnian Serb leaders have conditionally signed the Vance-Owen peace plan but the world is longing for positive, viable results.

IF THE GOING SEEMS EASY,
YOU'RE GOING
DOWNHILL

We can , at least, give the Serbs credit for not mincing words and frankly announcing to the world that they would not let any Muslim exist here.

Muslims everywhere have no grouse if US, British and French soldiers have not been allowed to fight for Bosnian Muslims. Why should they? NATO interests are not involved. Our heart-searching is that their governments stand in our way of fighting shoulder to shoulder with the Bosnia Muslim, and even obstruct our making available to them whatever war weaponry we are capable of.

And why are we so weak and helpless as to depend on our opponents for the performance of such a humanitarian duty? Dare we face the truth? We ourselves are not altruistic enough, we are not interested enough, and because we are not interested enough, we are not united enough amongst ourselves. Sympathy is the maximum we are capable of. Our tragedy is based in ourselves, not in our adversaries.

And so the Muslim of Bosnia is left all by himself to fight it out as best as he can. His courage and his determination are astonishing. He is fighting many enemies with a single hand: he is fighting the Serbs of his own country, the Serbs of Serbia proper, the Russians plus Russian war potential, the entire non-Muslim nations surrounding him as far as Italy and the Vatican, the Christian Secretary General of the United Nations, and above all, he is fighting the hypocrisy of Anglo American peace efforts!

To date, 80 per cent of Muslim territory has fallen to the aggressor. The remaining 20 per cent will also follow while the US led Security Council meets and meets again and again to talk and talk and talk. Then will come the turn of Tusla and such towns where the wounded are being treated in hospitals and are reported to be safe, but for how long?

Lord Robert Owen is reported to have argued that if the Bosnia Muslims were not deprived of war weaponry, the war would expand and the UNO peace personnel would not be able to rescue the wounded or evacuate the women.

Logic amazing enough to baffle any mind! First, leave the victims of aggression incapable of defending them-selves , that is, deliberately have them killed, wounded, tortured and raped so that humanitarian aid may be extended to them!

The Serb reaction should also be seen as the frustration of their hopes to merge the entire Bosnian territory with Serbia so as to form a Greater Serbia and rule over the Muslims and Croats by coercion.

It also brings to the surface their deep-rooted hatred of non-Serbs, particularly of the Muslims. Encouragement too was unlimited. Not only was the Russian arsenal open to them to pick and choose from at will, far more supportive

was the thought, right or wrong, that whatever might be the non-Christian character of the Christian powers the world over, they, after all, did belong to the same banner and none of them would ever take sides against them in favour of the Muslims. Armed with this belief they announced that their war was no ordinary war but a crusade.

And crusade, in some respects, it has turned out to be, whatever the real motive. The three 'Christian' powers, USA, Britain and France unanimously decided to impose an embargo on arms supplies to the Bosnia Muslims but none on supplies to the aggressor Serbs. Could anything have been more blatantly treacherous? Taking away from the victims of aggression the means of defending themselves while, in effect, helping the aggressor to go on impudently with killing, rape and torture!

Sure enough, the UN Security Council has met several times to discuss and deliberate, but with what motive, what strategy and to what purpose?

MOTIVE: to placate Muslim sympathies, specially of the Arab OPEC;

STRATEGY: procrastination and bluff;

PURPOSE: extermination of as many Muslims as possible from territory that a fellow Christian country wanted freed of Muslim presence.

At least, so it appears.

God alone knows the innermost secrets of the hearts of His creatures, but that is the logical conclusion to which the behaviour of the 'Christian' NATO politicians in their respective governments, and without, has forced even a dispassionate, neutral writer like me, to arrive at.

AS SAVAGE AS THE SERBS

Is it really a crusade?

by

--SHAKIR RIZWANI--

OF THE GREAT EPICS of heroism the world has known that of the Muslims of Bosnia will go down in the annals of history as one of the greatest.

Following the break-up of the Soviet empire in 1991, and the further splitting up of its grouped nationalities, the component ethnic states and peoples of Yugoslavia decided to be independent of one another, just as they had become of Russia. As this process of dissolution and reconstitution was being hurriedly implemented, the Croats and Muslims of Bosnia-Herzigovina declared that they would constitute independent sovereign states of their own based on the territory where they had lived for millenniums.

There was nothing unusual about this declaration which should have been accepted by the Serbs , as the Muslims (and Croats) would now be contained within well demarcated frontiers while the local Serbs could merge with adjoining Serbia. But the Serbs not only refused recognition of this basic right, and instead of beginning with civilized discussion and dissuasion, straightway answered with gunfire, sanctioned by the main body of fellow Serbs in Serbia proper and, no doubt, certain of unlimited help in war weaponry from Russia.

This fact alone proves that the Muslims and Croats here were justifiably apprehensive of the Serbs and of living alongside of them. Subsequent events proved much more.

The Serbs are savage by nature. Consider the unnecessary torture, the wounds inflicted on civilians, never enough to kill outright but to cause pain and slow agonising death; consider the gang rapes; the locking up in tiered cages so that the excreta of those above may fall on those below. Such being the ingrained lunacy, coexistence with them was impossible. In other words, an independent sovereign state was the only alternative open to the Muslims and Croats.

the manner Allah intended. The desired results must be produced. This is the great truth revealed through the Quran, disregard of which has rendered our prayers and fasting of no avail. We continue observing these rites and formalities and are satisfied that if they are not producing the desired results here, they will stand us in good stead in the hereafter. This attitude is not at all correct, according to the Holy Quran the results (of Allah's Laws) are bound to be produced in this world as well as the next. If their results are not being produced in this world, then, there should be no doubt in our minds that we are not observing these laws in the correct manner. hence the fruit of their results will not be available to us in the hereafter either.

Sum up

By way of summing up it may be said that the term "Al-Kitab-Wal-Hikmah" (the law and its Results) is the basic point of 'Deen'. The pleasant results of following the dictates of the Holy Quran accrue in this world and continue accruing in the hereafter. Hence where it is necessary to determine what exactly is Allah's Law in a particular matter, it is equally necessary to determine what result the observance of that law will produce. In this way we can exercise a constant check individually and collectively whether the dictates of the Quran are being correctly followed or not. Without such a check a false sense of complacence can prevail making even wrong actions appear as right.

Will we think?

SELF ASSESSMENT

" Hinduism as a faith is vague, amorphous, many sided, all thing to all men. It is hardly possible to define it, or indeed to say definitely whether it is religion or not, in the usual sense of the word. In its present form, and even in the past, it embraces many beliefs and practices, from the highest to the lowest, often opposed to or contradicting each other."

JAWAHARLAL NEHRU
IN HIS BOOK" THE DISCOVERY OF INDIA PAGE 37)

understand the law and implement it with full conviction, that is why 'Hikmah' has also been revealed by Allah along with the Law (Kitab). Both are preserved in the Quran:-

"It is the Grace of Allah that HE has sent down to you a code of Laws (Kitab) and its philosophy, its purpose (the why of it) 'Hikmah' for your instruction and guidance. (4:113)"

At places the Quran has been referred to simply as ' Hikmah' الْحِكْمَةَ (17:39) , while at other places as "The Book" and 'Hikmah' (2:231) using singular pronoun for both the expressions , thus indicating clearly that reference is to one and the some thing i.e., the Quran. Again. when we ponder over the verse 33:34, it becomes abundantly clear that 'Hikmah' is part of the revelation contained in the Quran and not outside it as is believed in some quarters.

Purpose of 'Hikmah' - Further Elaborated

There was a great purpose in sending down 'Hikmah' through Revelation. Allah has ordained injunctions and laws for the purpose of producing results, in other words the law is not an end in itself but a means to an end 'the result'. If Allah had merely given us the law without telling us the results they should produce, it is quite possible that we would have followed them in a mechanical manner and satisfied within ourselves that Allah's will has prevailed. But Allah in HIS Wisdom gave us the laws and also made clear to us what results their observance would produce. Hence there is constant need for alertness at every step to determine whether or not the desired results are being produced. If not we should pause and ponder where did we go wrong. Let us take one or two examplesto drive the point home. Take for example 'Salat'.
The Holy Quran says "Establish 'Salat'" الصَّلٰوةَ . "For 'Salat' restrains from shameful and wrong deeds" (29:45)

In this "Establish 'Salat'" is the Law (AL-Kitab), and "Salat will restrain from shameful and wrong deeds" is its philosophy; result . If 'Salat' is not producing this result then we have to pause and think where we went wrong. when Allah has HIMSELF stated that establishment of 'Salat' will produce these results, it can never be otherwise because Allah does not err.

Let us take another example. The Holy Quran says: "Fasting is prescribed to you". This is followed by: "That you may learn self restraint". (2:183). The first part is Law (Kitab) and the seconds is its philosophy or result ('Hikmah') The purpose of this law is to mould the Faithful into a special class of men ('Muttaqi'). If this result is not being produced then we should realise that this law is being observed as a mere formality and not

IN the name of Allah, the Rahman, the Raheem

AL-KITAB-WAL-HIKMAH

BY

Brig (Rtd) IZAZ D.A. KHAN

(Note: Some lovers of the Holy Quran in N. Vancouver (B.C.) Canada, have formed an Association Known as "United Muslim Association" with the object of spreading the Quranic Message of Truth and Unity. Sometime ago its Chairman asked me to write a short explanatory note on the Quranic term "Al-Kitab-Wal-Hikmat (2:151, 4:113) for their News letter. The "Explanatory note" is reproduced below as it may interest the readers. Author)

Quran - A Message For Mankind

Allah in HIS Wisdom has described HIS "LIGHT of Truth" Al-Quran as a Message for human kind to guide it to its destination. (14:52). The fundamentals of this Divine code of life are contained in the Holy Quran - the Book which Allah revealed to the prophet Muhammad (P.B.U.H) who handed it over intact to the Ummat to be passed on from generation to generation for all time to come. The duty of the Holy Prophet (PBUH) was not only to deliver to human kind the code of life revealed to him by Allah, but also to explain, teach and instruct his people the laws of this code and the philosophy behind them with a view to establish a social order in accordance with the fundamentals of the Divine Code that he had delivered. And this he did. The delivery of the Divine Code to all human kind and the establishment of a social order in accordance with the principles of the Divine code contained in the Quran now devolved upon the nation or Ummah that believes in the Quran, that is, us. We must therefore strive to re-establish the same Quranic social order which was established by the Muslims of the First Period, in the light of the Fundamental laws (Al-Kitab) and the philosophy behind them (Al-Hikmat), both revealed in the Book of Allah-al-Quran.

Al-Kitab-Wal-Hikmah الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ

In the Holy Quran the word 'Hikmah' has appeared in conjunction with the word 'Kitab' Both words form part of the Divine Message (4:113). Kitab (The Book) means 'The Law' and 'Hikmah' means the philosophy behind the law (The why of it). It is 'Hikmah' that indicates the real purpose of the law, the correct direction in which to proceed in order to achieve the desired result. If Allah's purpose had been to autocratically impose HIS Law the Quran would have contained only the law without the 'Hikmah'. But since Allah's purpose is to impart wisdom to man to enable him to fully